شناخت کے قیدی

اُن بیس لاکھ شہیدوں کے نام جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک شناخت دے گئے
مگر اُن کی اولادیں آج بھی اپنی ہی شناخت میں قید ہیں

سید عتیق الحسن، سڈنی آسٹریلیا



شناخت کے قیدی
سید عتیق الحسن، سڈنی آسٹریلیا



بسم اللہ الرحمن الرحیم

شناخت کے قیدی

شناخت کے قیدی

سیّد عتیق الحسن

(سڈنی آسٹریلیا)

باذوق لوگوں کے لیے
ہماری کتابیں
خوبصورت کتابیں
تزئین واہتمام اشاعت

خالد شریف

All rights reserved with the author.
Permission may be taken from writer/ publisher
to reproduce anything contained in this book.

ضابطہ

اشاعت : 2018
ناشر : ماورا پبلشرز، لاہور
کمپوزنگ : طارق محمود (0345-4690652)
طابع : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت : -/500 روپے آسٹریلیا: 20 ڈالر

خوبصورت کتب کی اشاعت کے لیے رابطہ

MAVRA BOOKS
60 - The Mall, Lahore.
Ph: 92 42 36303390
Mob: 0300 - 4020955
e-mail: mavrabooks@yahoo.com
khalidsharif1847@gmail.com

انتساب

یہ کتاب میں اپنے دادا سیّد **واجد علی** مرحوم کے نام کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے دادا کے بارے میں کچھ یاد نہیں کیونکہ جب انکا انتقال ہوا تو میں صرف تین برس کا تھا، مگر اپنی دادی افضال بیگم اور والدین سے سنا تھا کہ نئی نسل میں پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے دادا مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔

سیّد واجد علی نے اپنی شریک حیات اور آٹھ بچوں کیساتھ ۱۹۴۷ میں ہندوستان کے شہر اجمیر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا اور پاکستانیت کے جذبہ سے سرشار ہوکر پاکستان ہجرت کر کے حیدرآباد سندھ میں آ کر آباد ہوئے۔ پیشہ کے اعتبار سے محکمہ پولیس سے وابسطہ تھے۔ ایک نہایت ہی با اصول اور نیک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے مالی طور پر بہت کٹھن حالات میں اپنے بچوں کو نئے پاکستان میں پالا اور نظریہ پاکستان اور اس کی اہمیت ان میں پروان چڑھائی۔ سیّد واجد علی کے نئے آنے والے مہاجرین کی آبادکار میں حیدرآباد میں بے لوث کام کیا۔ حیدرآباد کی سرفراز کالونی جو بزرگ شہید ہستی سرفراز شاہ کلہوڑا کے نام سے آج حیدرآباد کی بڑی آبادیوں میں سے ایک ہے سیّد واجد علی کا ہی کارنامہ ہے۔ آج سیّد واجد علی کی نسل پاکستان سمیت دنیا کے مختلف ممالک میں اعلیٰ شعبوں میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے۔ آفرین ہے میرے دادا سیّد واجد علی اور اُن جیسے لاکھوں مہاجرین پر جنہوں نے پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور اپنی نسلوں کو ایک نئی شناخت بخش دی۔

سیّد عتیق الحسن

ترتیب

پیش لف سید عتیق الحسن ۱۱

۱۔ مجھے آج بھی یاد ہے ۱۹

۲۔ میری شناخت آزاد پاکستان میں! ۲۵

۳۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان ہجرت کیوں کی؟ ۳۱

۴۔ میں نے تعصب و تقسیم کا بازار دیکھا ۴۱

۵۔ مشرقی پاکستان سے بنگلا دیش، اور پاکستان میں تفریق ۵۱

۶۔ سندھ کے تعلیمی ادارے تعصب کی آماجگاہیں اور
پھر الطاف حسین کی آمد ۵۹

۷۔ سرکاری اداروں میں فوجیوں کی مداخلت اور
سندھ میں نفرتوں کا بازار ۶۹

۸۔ دیارِ غیر اور رگوں میں پاکستانیت ۸۵

۹۔ آج میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں! ۹۷

۱۰۔ کیا تعصبات کی قید سے رہائی اور شناخت کا تعین ہو گا ۱۰۹

۱۱۔ کچھ سوالات آخر میں ۱۲۱

* * *

تھا کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(غالبؔ)

تعارف

حالات، واقعات، یقین، مقصد اور زندگی میں کچھ کرنے کا جذبہ وہ عناصر ہیں جن کی بدولت انسان نا صرف اپنوں سے بچھڑنے بلکہ ایک مقام پر اپنی سرزمین کو بھی خیر باد کہنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ میرے آباواجداد نے تبلیغِ اسلام کی غرض سے آٹھویں صدی میں سرزمینِ عرب کو خیر باد کہا اور وسط ایشیا کی ریاستوں کی طرف کوچ کر کے ثمر قند اور بخارا کو اپنا گھر بنایا۔ پھر بارھویں صدی میں ایران اور سولہویں صدی میں مغل بادشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت میں ہندوستان ہجرت کی۔

میرے دادا نے اپنے خاندان کے ساتھ 1947 میں اپنے جدی پشتی اثاثے، زمین، تین صدیوں پر محیط کلچر، رسم ورواج اور کئی نسلوں سے ساتھ رہنے والے لوگوں کو الوداع کہہ کر پاکستان کوچ کیا۔ میرے دادا اور ان کے عزیز واقارب کا ہندوستان چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنے کا مقصد تھا کہ ان کے بچے اور آئندہ نسلیں ایک آزاد ماحول میں زندگی بسر کر سکیں جہاں اپنے مذہب پر چلنے، رسم ورواج کو قائم رکھنے، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور معاشی خوشحالی کو ممکن بنایا جا سکے۔ مجھے اپنے دادا کا یاد نہیں کیونکہ ان کی وفات کے وقت میری عمر صرف تین سال تھی۔ مگر میں نے اپنی دادی،

چچاؤں، چچیوں اور والد کو عزت سے زندگی بسر کرنے اور کچھ حاصل کرنے کے لئے انتھک محنت ومشقت کرتے دیکھا۔

جب تک میرے ماں باپ زندہ رہے وہ اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لئے انتھک محنت کرتے رہے۔ میں نے ان میں وطن اور سماج کے لئے بے مثال نیک جذبات دیکھے۔ بالخصوص والد صاحب کو ساری زندگی میں نے لوگوں کی بھلائی کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے اور معاشرہ کے بہتر مستقبل کے لئے عوامی محفلوں میں تقریریں کرتے دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزرتا گیا۔ خاندان کے ہر فرد کو میں نے بچپن ہی سے حالات سے مضبوطی سے لڑتے اور بہتر مستقبل کے لئے جستجو کرتے دیکھا۔ پاکستان سے پیار تو ہمارے لئے ایک فطری عمل تھا کیونکہ پاکستان ہی کی خاطر میرے باپ دادا پاکستان آ کر آباد ہوئے تھے مگر شاید مستقل ہجرت کرنا ہمارے خاندان کے نصیب میں ہی لکھا تھا۔

وقت نے ہماری خاندانی روایات کو ایک مرتبہ پھر دہرایا اور میں بہت جدوجہد، حالات سے سمجھوتہ، پاکستان میں رہتے ہوئے ملک وقوم کے لئے کچھ کرنے کی جستجو کے باوجود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر زندگی میں کچھ اور آگے بڑھنا ہے، بچوں کے بہتر مستقبل اور استحکام کے لئے کچھ کرنا ہے تو اپنے پیارے وطن پاکستان کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ یقیناً پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ میرا کوئی جذباتی فیصلہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کا مادی لالچ تھا کیونکہ جس وقت میں نے آسٹریلیا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ

ہجرت کی میری عمر صرف ۳۰ سال تھی اور میں پاکستان کے ایک بڑے محکمہ میں ۱۸ گریڈ کا آئی ٹی آفیسر تھا۔ آسٹریلیا بحیثیت پروفیشنل ہنرمند بیوی بچوں کے ساتھ آسٹریلوی مائیگرینٹ ویزے پر پاکستان کو چ کیا۔

آج جب پاکستان چھوڑنے کا سبب آپ سے پوچھتا ہوں تو جواب میں ایک یا دو وجوہات نہیں پاتا بلکہ بچپن سے لیکر جوانی تک ہوئے تلخ تجربات اور مشاہدات پاتا ہوں جن کا تعلق صرف میری یا میرے خاندان سے نہیں بلکہ میرے شہر، صوبے اور ملک کے پورے معاشرے سے ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ آج کئی دہائیاں گزرنے اور اپنی آبائی سرزمین سے ہزاروں میل دور رہنے کے بعد بھی پاکستان میری شناخت کا اتنا ہی اہم حصہ ہے جتنا اس وقت تھا جب پہلی بار میں نے اپنے وجود کی پہچان اپنی ذات سے جڑی چیزوں سے کی تھی۔ پاکستان سے اتنا پیار ہے کہ میں یہ ہی دعا مانگتا ہوں کہ اللہ میرے مرنے کے بعد میرے جسم کو پاکستان کی مٹی عطا فرمائے۔ شاید پاکستان کے لئے یہ میرے سچے جذبات ہی ہیں کہ میں اپنی زندگی میں ہوئے واقعات کو قلمبند کرنا چاہتا ہوں اس اُمید کے ساتھ کہ شاید کوئی میرے واقعات کو پڑھ کر مجھ جیسے پردیس میں بسنے والے لاکھوں پاکستانیوں کے احساسات کو سمجھے اور ماضی کے ان سیاسی، علاقائی اور گروہی واقعات کی وجوہات کی تہہ میں جانے کی کوشش کرے جس کی وجہ سے آج پاکستان دنیا کے لئے ایک سوال بن گیا ہے۔

پاکستان بنانے کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کے بنیادی انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کرنا تھا اور ایک آزاد ریاست میں رہتے ہوئے سب کو انصاف، امن اور شہری آزادی فراہم کرنا تھا تاکہ لوگ اپنے مذہب، ثقافت اور تہذیب پر چلتے ہوئے دنیا کے لئے ایک مثالی قوم ثابت ہوں اور وطنِ عزیز کو ایک عظیم اسلامی مملکت بنائیں۔ مگر بدقسمتی سے آج یہ سب باتیں خواب نظر آتی ہیں۔ آج پاکستان میں مسلمان ہی مسلمان کے دشمن ہیں۔ ملک کے امن وسکون کی بات تو درکنار لوگ مذہبی مقامات پر بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتے۔ آج پاکستان میں لوگ پاکستانی نہیں سندھی، مہاجر، پنجابی، سرائیکی، بلوچی اور پٹھان بن کر سوچتے ہیں۔ شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کونسی بات ایسی باقی رہ گئی ہے جس پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان جس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا پاکستانی قوم اور پاکستان کو چلانے والی قوتیں اس پر قائم ہیں۔ پاکستان آج جس مقام پر کھڑا ہے اس کے پیچھے نہ صرف پاکستان کی تاریخ کے ستر سالوں کے سازشی اور نااہل سیاستدان ہیں بلکہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا ساتھ دینے والے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور آج کے صوبہ پختون خواہ کے وڈیروں، چودھریوں اور سرداروں کا وہ مفاد ہے جس کا سودا انہوں نے پاکستان کی تحریک میں شامل ہوتے وقت کیا تھا۔ یہ ہی وہ جدی پشتی ریاستی ٹولہ ہے جو پاکستان کی اکثریت پر اسی طرح سے حکومت کر رہا ہے جس طرح سے پاکستان کے بننے سے

پہلے کر رہا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پاکستان کے وجود سے پہلے یہ وڈیرے، جاگیردار اور سردار انگریزوں کے ساتھ مل کر لوگوں پر حکومت کرتے تھے اور پاکستان بننے کے بعد یہ سامراجی طاقتیں پاکستانی فوج اور بیوروکریٹس کے ساتھ مل کر پاکستان کو لوٹ رہے ہیں۔ یہ ہی وہ ٹولہ ہے جو انگریزوں سے وفاداری کے صلہ میں انعام و اکرام حاصل کر کے وڈیرے، جاگیردار، اور پیر بنے اور انہی ٹولوں کی نسلیں آج وڈیرے، جاگیردار، قبائلی سردار اور پیر نہیں بلکہ سیاسی پارٹیوں کے بانی و قائد بنے جمہوریت کے نام پر پاکستانی عوام پر حکومت کر رہے ہیں۔

یہ وہ چند خاندان ہیں جو پاکستان کے ہر صوبے میں موجود ہیں جن کے ہاتھ صرف پاکستان کی بنیادوں تک ہی نہیں پھیلے ہوئے بلکہ مغربی طاقتوں تک ان کی رسائی ہے۔ ان کے بچے مغرب کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھتے، مغرب کے آزاد معاشرے میں رہتے اور عیاشیاں کرتے ہیں اور پھر جب مغرب کی عیاشیوں سے دل بھر جاتا ہے تو پاکستان میں آ کر سیاسی پارٹیوں کی قیادت سنبھال لیتے ہیں، پاکستان کی اسمبلیوں میں بیٹھ کر اپنے مفادات کے مطابق قانون سازی کرتے ہیں اور پھر ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہونا اپنا بنیادی حق سمجھتے ہیں اور صدارت، وزارت اعظمیٰ سمیت اعلیٰ وزارتوں پر بیٹھ کر ملک و قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔

مگر سب سے بڑے المیے کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے سچے جذبے سے پاکستان کے خواب دیکھے تھے، جن کے ماں باپ نے پاکستان کے لئے اپنی جانوں

کے نذرانے دیئے، جنہوں نے اپنی جدی پشتی اثاثے، رشتہ دار اور صدیوں پرانے رسم و رواج کو پاکستان کی خاطر چھوڑا آج ان کی اولادیں پاکستان میں اپنے آپ کو لاوارث پاتی ہیں۔ جو اپنے ہی ملک میں اپنی شناخت کے قیدی ہیں اور جو اپنی عزتِ نفس کو برقرار رکھنے کے لئے پاکستان سے کوچ کر جانے پر مجبور ہیں۔ ظلم، تعصب، جبر اور ناانصافیوں کے میری زندگی میں بے شمار مشاہدات اور تجربات ہیں اور میری اپنی زندگی کی کہانی بھی اس ہی طبقے میں لاکھوں کہانیوں کی طرح ایک کہانی ہے جو میں اس کتاب میں قلمبند کر رہا ہوں کہ شاید کبھی کسی کو یہ احساس ہو اور اللہ ان کو وہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ پاکستان اور اس کی عوام کو غلامی، ظلم، لوٹ مار اور ناانصافیوں سے آزادی دلائیں اور پاکستان کو وہ پاکستان بنائیں جس کا خواب محمد علی جناح نے دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تھا مِرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(مومنؔ)

مجھے آج بھی یاد ہے!

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے یہ 1960 کی دہائی کے آخری سال تھے۔ میں اپنے شہر حیدرآباد کے مشہور محلہ سرفراز کالونی کے ایک پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ والد مرحوم سید شفیق الحسن شہر اور محلہ میں بحیثیت سماجی کارکن کافی سرگرم تھے۔ پاکستان کے قومی دنوں کو منانے کا جذبہ میں نے اپنے والد میں بے انتہا پایا تھا۔ میرے ذہن میں وہ مناظر آج بھی نقش ہیں جب میرے والد نے پہلی مرتبہ مجھے جشن آزادیِ پاکستان کے اسکول کے فنکشن میں ملی نغمہ پڑھنے کو دیا تھا جس کے بول: ''یوں دی ہمیں آزادی کے دنیا ہوئی حیران، اے قائداعظم تیرا احسان ہے احسان۔۔۔'' آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔

گو میں اور مجھ سے تین سال چھوٹا بھائی سید انیس الحسن بہت چھوٹے تھے مگر والد صاحب جب بھی رات میں فارغ ہوتے والدہ کو ساتھ میں بٹھا کر مقامی و ملکی سیاست اور قومی لیڈران کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ یومِ پاکستان اور آزادیِ پاکستان پر والد صاحب سرفراز کالونی کی ویلفیئر سوسائٹی، جس کے والد بانیوں میں سے تھے، کے تحت رنگارنگ پروگرام کرایا کرتے تھے۔ بڑے سے اسٹیج کو پاکستان کی

جھنڈیوں، قائداعظم، قائدملت اور دوسرے بانیِ پاکستان شخصیات کی قد آور تصویروں سے سجایا جاتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر صبح سے ہی پاکستان کے قومی نغمے بجائے جاتے تھے۔ اکثر میری اور چھوٹے بھائی کے حصہ میں اسٹیج پر قومی ترانہ پڑھنے کا ذمہ لگایا جاتا تھا اور ہم گھنٹوں اسٹیج کے پیچھے بیٹھے قومی نغمے کو خوبصورتی سے گانے کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔ پروگرام کے اختتام پر مٹھائیاں بانٹی جاتیں تھیں اور کبھی کبھی تو پردہ پر پاکستان کی قومی فلمیں بھی دِکھائی جاتی تھیں۔

سرفراز کالونی سے ملحق فوجی چھاؤنی تھی۔ جس کے گراؤنڈ میں ہم کرکٹ کھیلنے جایا کرتے تھے۔ چھ ستمبر یوم دفاع کے موقع پر چھاؤنی میں بہت بڑا فوجی میلہ لگتا تھا، جس کی خصوصیت فوجی نمائش تھی۔ ہر طرح کے فوجی ساز و سامان کی نمائش کے ساتھ پاک فوج کے جوانوں کی بھارت کے خلاف جنگ میں کامیابی کے کارناموں کی نمائش سجتی تھی، بھارتی فوجیوں کی بار اور جنگ میں چھوڑ کر بھاگنے والے ہتھیاروں کی نمائش ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے بچے بوڑھے عورتیں سب ہی فوجی بھائیوں کے کارناموں پر فخر کرتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی فوجی جوان نظر آیا لوگ رک کر اس کو عزت سے سلام کرتے تھے۔

مذہبی تہوار شہر میں بڑی دھوم دھام و جوش و جذبہ سے منائے جاتے تھے۔ خاص کر ربیع الاول اور محرم الحرام کے مہینوں میں بڑی بڑی مجالس، سبیلیں اور جلوسوں کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ والد صاحب ان پروگراموں میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ لاکھوں افراد کے جلوس گھنٹوں شہر کی مرکزی شاہراہوں سے گزرتے تھے۔ کسی کو کوئی پتہ نہیں

ہوتا تھا کون کس فرقہ سے ہے اور نہ ہی کسی کو کسی دہشت گردی کا کوئی خوف ہوتا تھا۔

میری والدہ بلقیس بیگم کا تعلق کراچی سے تھا۔ اکثر اسکول کی چھٹیاں گزرنے ہم حیدرآباد جایا کرتے تھے۔ میرے سب سے چھوٹے ماموں، مختار احمد، مجھ سے عمر میں صرف دو سال بڑے تھے اس لحاظ سے ہمارے تعلقات ماموں بھانجے سے زیادہ جگری دوستوں کے تھے۔ نانا کا گھر کراچی کینٹ اسٹیشن کے نزدیک تھا۔ اس وقت کا مشہور فریئر ہال گھر سے صرف دس سے پندرہ منٹوں کی دوری پر تھا۔ اکثر ہفتہ وار چھٹی کی رات فریئر ہال میں پاکستانی فلم بڑے پردہ پر چلائی جاتی تھی۔ ان فلموں میں زیادہ تر ایسی فلمیں ہوتی تھیں جن میں قومی جذبہ، اسلام یا مسلمانوں کے موضوع اور مسائل کو اُجاگر کیا جاتا تھا۔ جیسے زرقا، اللہ اکبر، سجدہ، شہید، دوستی وغیرہ۔ کراچی کینٹ کی انتظامیہ کینٹ اسٹیشن کے ساتھ اپنے احاطے میں قومی موقعوں پر بچوں کے کھیلوں کے مقابلے کراتی تھی۔ بچوں کو مختلف انعام واکرام دیئے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور میرے ماموں نے بچوں کی ریس میں میڈل حاصل کئے اور ہم نے خوشی خوشی اپنے گھر والوں کو دِکھایا جنہوں نے بڑی شاباشی دی۔ کینٹ اسٹیشن سے صدر وقفے وقفے سے ٹرامیں چلا کرتی تھیں جو کہ تفریح کے طور پر بھی لوگ استعمال کرتے تھے۔ مگر ہم بچے اکثر شغل کرتے پیدل پیدل صدر جایا کرتے تھے۔ صدر جانے کا مقصد ہمارا غیر ملکی لوگوں کو دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا ہوتا تھا۔ صدر کے علاقے میں اُس وقت کا مشہور بوہری بازار ہوا کرتا تھا۔ جس کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں یورپین مرد اور عورتیں گھومتے نظر آتے تھے جنہیں ہم انگریز کہتے تھے۔ ہم بچے ان سے ٹوٹی

پھوٹی انگلش میں بات کر کے بڑے خوش ہوتے تھے۔

میں پاکستان سے جڑی یادوں اور لمحوں کو ذہن کے عکس سے نہیں نکال سکتا۔ میرے ذہن میں وہ نقش آج بھی زندہ ہیں کہ جب پاکستان کے قومی دنوں کو میں اپنے ہم جماعت دوستوں، محلے کے ساتھیوں، بھائی بہنوں اور ماں باپ کے ساتھ فخر سے مناتا تھا اور ہم بچے اپنے پاکستانی ہونے پر ناز کرتے تھے۔

☆☆☆

خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

(قتیلؔ شفائی)

میری شناخت آزاد پاکستان میں!

آج جب میں اپنی پاکستانی شناخت اور پھر پاکستان کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں تو ذہن میں ایک انتشار جنم لیتا ہے۔ انتشار کی وجہ شاید وہ متضاد حقیقتیں ہیں جو میری زندگی میں معاشرتی خرابیوں کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ جیسے جیسے میں پروان چڑھتا گیا اسکول سے کالج، کالج سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے پروفیشنل زندگی میں قدم رکھا مجھے میرے ماں باپ کی دعاؤں اور اپنی محنت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے اُس کا پھل عطا کیا مگر ساتھ ساتھ ہر قدم پر پاکستانی سسٹم نے یہ باور کرایا کہ میں اس زمین پر ایک دوسرے درجہ کا شہری ہوں۔ یہ بات میں کسی احساس یا جذباتی لگاؤ کی بنا پر نہیں کر رہا بلکہ میرے ساتھ ہونے والے اور میرے مشاہدہ میں آنے والے واقعات ہیں جن کا ذکر میں اس کتاب میں آگے چل کر کروں گا۔ آج اگر پاکستان میں موت سستی ہوگئی ہے، لاقانونیت کا راج ہے، لوٹ مار کا بازار گرم ہے، صوبائیت، لسانیت، فرقہ پرستی، شخصیت پرستی اور اقربا پروری سسٹم کا حصہ ہے تو یہ کسی ایک حکومت کے دور کا کرشمہ نہیں اور نہ ہی راتوں رات ہونے والے واقعات کا ردِعمل ہے بلکہ یہ پچھلے ستر سال میں جنم لینے والی وہ بیماریاں ہیں جن کی زد میں جو جو آیا

اس کا علاج نہ کیا گیا اور مرض وبا کی شکل اختیار کر گیا اور ایک ناسور بن کر پورے جسم میں پھیل گیا ہے۔

میں نے جب معاشرے میں جنم لینے والی چیزوں کو سمجھنا شروع کیا تو اپنے گرد لوگوں کو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں چہ مہ گوئیاں کرتے دیکھا اور آج زندگی کے سفر کا تین چوتھائی حصہ گزارنے کے بعد بھی محبِّ وطن پاکستانیوں کو پاکستان کی سلامتی کے بارے مین پریشان ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ میں نظریہ پاکستان کا وجود، پاکستان کی جدوجہد اور پاکستان کے قیام کے شروع کے سالوں کی تاریخی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد میرے پاکستان بالخصوص سندھ جہاں میں پیدا ہوا، سے جڑے ذاتی تجربات و مشاہدات کو قلمبند کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں پاکستان حاصل کرنے کی جدوجہد اور قیام کے کچھ حقائق پر روشنی بہت ضروری ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی سوچ کا نتیجہ تھا۔ یہ سوچ ہندوستان کے اکثریتی مسلمانوں کی تھی۔ پاکستان کے حصے میں ہندوستان کے وہ صوبے آئے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی یعنی بنگال، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد۔ ان صوبوں میں صدیوں سے رہ رہے لوگوں کی اپنی الگ ثقافت، تہذیب، زبان اور رہن سہن کا مخصوص رسم و رواج تھے۔ سوائے کسی حد تک بنگال کے باقی صوبوں میں لوگ صدیوں سے قائم سرداری، جاگیرداری اور قبائلی نظام میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان صوبوں کے باشندوں کو ہندوستان کی سیاست اور مسلمانوں کے حقوق سے کوئی لینا دینا نہیں تھا ان

کے لئے اگر کچھ تھا تو ان کا اَن داتا تھا جس کی زمین پر وہ کام کرتے تھے۔ آمرانہ نظام میں جکڑے ہوئے ان لوگوں کی اپنی کوئی آواز نہیں تھی ہاں ان کے جاگیردار، وڈیرے اور سردار کا حکم ہی ان کی آواز تھی۔ یہی وہ وجہ تھی کہ جب 1935 کے بنائے گئے ایکٹ کے تحت انگریز حکومت نے 37-1936 میں ہندوستان کی صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے عام انتخابات کروائے تو آل انڈیا مسلم لیگ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور فرنٹیئر میں بری طرح ہاری جو کہ مسلمانوں کے اکثریت والے صوبے تھے۔ جس کی وجہ اُس وقت تک یہاں کے سرداروں، جاگیرداروں اور چودھریوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے منشور اور مقاصد سے اتفاق نہیں کیا تھا اور انتخابات میں انہوں نے مسلم لیگ کے بجائے کانگریس کی حمایت کی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھیوں کے پاس ان صوبوں کے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ ان سرداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کو کسی طرح سے آل انڈیا مسلم لیگ میں لاکر اکثریتی مسلمانوں کی حمایت حاصل کی جائے۔ لہٰذا قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے ساتھیوں نے پنجاب کے چودھریوں، سندھ کے وڈیروں اور بلوچستان اور سرحد کے سرداروں کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس سے پہلے تک اِن صوبوں کے مقابلے میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد میں پاکستان بنانے کی تحریک عوامی سطح پر اتنی طاقتور نہیں تھی جتنی کہ مسلم اقلیتی صوبوں میں۔ پھر جب پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے چودھریوں، وڈیروں اور سرداروں

نے آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تو مسلمانوں کی ترجمان یہ جماعت مضبوط ہوگئی۔ اور پھر جب 46-1945 کے عام انتخابات ہوئے تو ان صوبوں سے آل انڈیا مسلم لیگ کو کانگریس کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی۔ ان انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ نے کھڑے کئے گئے 495 امیدواروں میں سے 446 میں کامیابی حاصل کی۔ دوسری طرف بنگال میں بھی آل انڈیا مسلم لیگ نے بھاری کامیابی حاصل کی مگر بنگال میں جیت کا سبب وہاں پر عوامی سطح پر مسلمانوں کا آل انڈیا مسلم لیگ اور قراردادِ پاکستان کی حمایت تھی۔ ان انتخابات کے نتائج نے ہی پاکستان کی سرحدوں کا تعین کیا۔ بالآخر 14 اگست 1947 کو صوبہ بنگال مشرقی پاکستان کی شکل میں اور سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد مغربی پاکستان کی شکل میں دنیا کے نقشہ پر پہلی اسلامی نظریاتی ریاست پاکستان بن کر اُبھرے اور یہاں میں بھی بتاتا چلوں کہ جب 14 اگست کی درمیانی شب پاکستان کا اعلان ہوا تو سب سے پہلے جس ملک کے پاکستان کی حیثیت کو تسلیم کیا وہ پڑوسی ملک ایران تھا۔

☆☆☆

میرے باپ نے ہجرت کی تھی مَیں نے نقل مکانی
اُس نے اِک تاریخ لکھی اور مَیں نے ایک کہانی

(مقسط ندیمؔ)

ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان ہجرت کیوں کی؟

پاکستان تو وجود میں آ گیا مگر پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح کو قدرت نے پاکستان میں بنیادی اصلاحات نافذ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ گیارہ ستمبر 1948 کو بابائے قوم کا انتقال ہوگیا اور یوں پاکستانی قوم ایک سال میں ہی یتیم ہوگئی۔ ملک کی باگ ڈور قائداعظم اور نظریہ پاکستان کے جیالوں نے جمہوری انداز سے چلانے کی کوشش کی۔ مگر پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے مضبوط جاگیردار، وڈیروں اور سرداروں نے اپنے نظام کو بدلنے نہیں دیا۔ لہٰذا مغربی پاکستان کو تحفہ میں ملنے والا آمرانہ نظام نہ صرف ختم نہ کیا جاسکا بلکہ پاکستان کے قیام نے جاگیردارنہ اور قبائلی نظام کو تحفظ کیا۔

سرداروں، وڈیروں اور جاگیرداروں کی حمایت سے بنائے گئے پاکستان میں کس طرح سے اِن کو یا ان کے نظام کو ختم کیا جاسکتا تھا جبکہ سندھ پنجاب، بلوچستان اور سرحد کا ساٹھ فیصد سے زیادہ حصہ پر ان کی حکمرانی ہو۔ جاگیرداروں، وڈیروں اور

قبائلی سرداروں نے پاکستان میں عام آدمی کی شہری آزادی اور حقوق کے لئے اپنے جاگیرداری نظام میں کبھی تبدیلی نہیں آنے دی۔ ہاں اگر پاکستان کے کسی حصہ میں آمرانہ جاگیرداری نظام نہیں تھا تو وہ سابق مشرقی پاکستان (بنگال) تھا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں اور مغربی پاکستان کو چلانے والے آمرانہ ٹولے کے درمیان کبھی بھی سیاسی یکسوئی اور اتفاق نہیں رہا اور بالآخر پاکستان بننے کے 25 سال بعد دسمبر 1971 میں مشرقی پاکستان پاکستان سے الگ ہوگیا اور آج دنیا کے نقشہ پر بنگلہ دیش کے نام سے آباد ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان اور پاکستان کو بنانے والوں کو کئی مسائل ورثہ میں ملے۔ 9 کروڑ برصغیر کے مسلمانوں میں سے 6 کروڑ مسلمان پہلے سے ہی پاکستان کی سرحدوں میں آباد تھے مگر 3 کروڑ مسلمان ہندوستان کے ہندو اکثریتی علاقوں میں آباد تھے۔ یہ وہ مسلمان تھے جنہوں نے پاکستان کی تحریک اپنے شہروں، قصبوں اور گاؤں کے چپے چپے میں چلائی تھی۔ یہ مسلمان ہندوؤں کی نظر میں ہندوستان کے غدار شہری تھے جنہوں نے ہندوستان کی تقسیم میں حصہ لیا تھا۔ لہٰذا لاکھوں مسلمان اپنے تحفظ اور پاکستان سے عملی وابستگی کی بدولت ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ پاکستان کے بانی قائداعظم، لیاقت علی خان اور ان کے تحریکی ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت سے ان مسلمانوں کے تحفظ پر ملکی سطح پر لین دین کیا جائے گا۔ لہٰذا 1950 میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کے ساتھ دونوں ملکوں کے اقلیتی

باشندوں کی ان کی مرضی سے ہجرت کا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ایک اندازہ کے مطابق 20 لاکھ مسلمان ہجرت کرکے پاکستان آئے اور سرکاری طور پر پاکستان کی شہریت حاصل کی۔ ہجرت کرنے والوں میں جو مشرقی پنجاب سے لاہور کے راستے آئے تھے اُن کی اکثریت پنجاب میں ہی آباد ہوگئی۔ ان مہاجرین کے لئے پنجابی زبان نے اہم کردار کیا اور یہ بہت جلد مقامی باشندوں میں ضم ہوگئے۔ اسی طرح سے مغربی بنگال سے مشرقی پاکستان جن مسلمانوں نے ہجرت کی ان کو بھی معاشرتی طور پر ایک زبان اور کلچر ہونے کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے مقامی باشندوں سے ساتھ بسنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس ہندوستان کے دوسرے علاقوں خصوصاً راجستان، دہلی، یوپی، سی پی، حیدرآباد دکن وغیرہ سے مغربی پاکستان ہجرت کرنے والے مہاجرین جن میں اکثریت کی مادری زبان یا رابطہ کی زبان اردو تھی وہ مقامی باشندوں کے ساتھ مختلف زبان، کلچر اور رسم و رواج کے ہونے کے ساتھ پوری طرح ضم نہ ہوسکے اور اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ پہچانے گئے۔ ان مہاجرین کی اکثریت سندھ کے شہروں بالخصوص کراچی، حیدرآباد، میرپورخاص اور سکھر وغیرہ میں آباد ہوگئے۔ اِن میں جو مہاجرین غیر ہنرمند تھے انھوں نے سندھ کے شہروں اور قصبوں میں چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرلیا اور پڑھے لکھے مہاجرین سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور کاروبار میں نوکریوں میں چلے گئے۔

میرے دادا سید واجد علی بھی، جیسے میں نے شروع میں ذکر کیا، اپنے بال بچوں

کے ساتھ پاکستان کے قیام کے وقت ہی یعنی اگست 1947 میں ہجرت کرکے پاکستان آ گئے تھے۔ دادا تقسیم کے وقت اجمیر پولیس سے وابستہ تھے لہٰذا راجستان کے راستے بذریعہ ٹرین حیدرآباد آ گئے۔ دادا کی سب سے چھوٹی بیٹی، سیدہ شمیم بانو، نے پاکستان ہجرت کے دوران جنم لیا۔ دادا کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ میرے والد سید شفیق الحسن بچوں میں سب سے بڑے تھے اور اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ میری سب سے چھوٹی پھوپھی، سیدہ شمیم بانو، نے ہجرت کے دوران جنم لیا، لہٰذا ہجرت کے دوران ناقابلِ بیان تکلیف اور مشکلات کے ساتھ دادا نے اپنے بال بچوں کے ساتھ پاکستان کو اپنا ہمیشہ کے لئے گھر بنایا۔

والد صاحب اکثر مجھے پاکستان ہجرت کرنے اور اس کے بعد کے قصے سنایا کرتے تھے۔ والد صاحب کے مطابق سندھ میں ٹرینوں کے ذریعے ہجرت کرکے آنے والوں کا مقامی لوگوں نے کھُلے دل سے استقبال کیا۔ مہاجرین کے لئے انصار نے ہر قسم کے دروازے کھول دیے تھے اور انہیں دِل سے لبیک کہا۔ دوسری طرف مہاجرین نے جو بھارت سے چلتے ہوئے یہ فیصلہ کرکے آئے تھے کہ اب ان کا جینا مرنا پاکستان میں ہی ہوگا پاکستان اور اس کی سرزمین کی آبادکاری اور کامیابی کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دیں اور مشکل حالات میں نہ صرف اپنے پیڑوں پر کھڑے ہوئے بلکہ جو جہاں آباد ہوا اس کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا۔

دادا نے حیدرآباد پولیس میں اپنی پولیس کی نوکری جاری رکھی مگر کچھ عرصہ بعد ہی ریٹائر ہوگئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دادا کے معاشی حالات اچھے نہ رہے۔ نہ کوئی بینک

بیلنس تھا، نہ نوکری اور نہ ہی اپنا گھر۔ ہجرت کے بعد حیدرآباد میں مارکیٹ کے علاقے میں ایک عمارت کے دوسرے مالے پر کلیم میں گھر ملا مگر آٹھ بچوں کے ساتھ رہنا ناکافی تھا۔ نیچے والا مالا مشرقی پنجاب سے ہجرت کرکے آئے ایک فیملی کو ملا تھا جن سے دادا اور دادی کے بہت اچھے تعلقات قائم ہوگئے اور دادا نے پورا گھر ان کو دے کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس وقت کے ایک خالی علاقے پر مہاجرین کے لئے آبادکاری کریں گے، لہٰذا قریب میں سرفراز شاہ کلہوڑہ کے مزار کے ساتھ قبرستان سے ملحق جو خالی زمین تھی وہیں خود اپنا ذاتی مکان تعمیر کیا اور اس جگہ پر سرفراز کالونی کی بنیاد بھی اپنے دوست احباب کے ساتھ مل کر رکھی۔ دادا نے گھر کے قریب ہی ایک کریانہ کی دکان کھول لی تھی مگر آمدنی اتنی نہیں ہوتی تھی کہ گھر گرہستی چل سکے۔ لہٰذا والد صاحب جو آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے دادا کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

دادا دادی نے والد صاحب کی شادی 1954 میں کراچی میں اپنے ہی جیسے ہجرت کرکے آئے خاندان میں ایک گھریلو لڑکی بلقیس بیگم (یعنی میری والدہ) سے کردی۔ والد صاحب کی عمر اس وقت صرف بیس سال اور والدہ کی سولہ برس تھی۔ شادی کے تین سال بعد یعنی 1957 میں میں پیدا ہوگیا۔ چھوٹے بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کی ذمہ داریوں اور ساتھ ہی اپنے مستقبل کی فکر نے والد صاحب کو شروع سے ہی بے حد محنت و مشقت کا عادی بنا دیا تھا۔ گھر میں دادی، چچاؤں، چچیوں، والدہ سب کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ دادی دکانداروں سے مختلف قسم کا کام گھر پر لے آتی تھیں۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر ابھی تک تھوڑا تھوڑا یاد ہے دادی ہمیں بٹھا کر کہتی تھیں تم بھی

ہمارے ساتھ ٹافیوں پر پنیاں لپیٹو اور کبھی آٹے سے سیوئیاں بنانے اور ان کے پیکٹ بنانے میں ہمیں بھی اپنے ساتھ لگا لیتیں تھیں۔ غرض کہ ہندوستان سے آنے کے بعد ہمارے جیسے ہر خاندان کو ایک بہت بڑے معاشی و سماجی چیلنج سے گزرنا پڑا۔ ہمارے گھر کے جیسے معاشی حالات اس وقت تقریباً ہجرت کرکے آنے والے کے تھے۔ اکثریت میں سندھ کے شہری علاقوں میں بسنے والے مہاجرین اور ان کی اولادوں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق کاروبار میں دلچسپی لی۔ سندھ کے شہری علاقوں میں رفتہ رفتہ محنت اور لگن کے نتیجے میں کاروبار ان کے ہاتھ میں آ گیا اور اِس طرح سے سندھ کی ترقی میں مہاجرین کا نمایاں کردار سامنے آنے لگا۔ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سندھ میں بالخصوص کراچی میں سب سے زیادہ مہاجرین آئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے شہروں کے مقابلے میں کراچی میں سب سے زیادہ تیزی سے خوشحالی اور ترقی دیکھنے کو ملی۔

سندھ میں مہاجرین اور انصار میں ایک اچھے بھائی چارے کی فضا پروان چڑھ رہی تھی۔ مہاجرین اردو سے بولنے سے پہچانے جاتے تھے گو کہ اِن میں پنجابی، پوربی، بنگالی، گجراتی وغیرہ مادری زبان بولنے والے بھی شامل تھے اور انصار (مقامی) سندھی زبان بولنے سے پہچانے جاتے تھے مگر یہ سب پاکستان کے جذبے سے سرشار تھے اور ان میں کوئی نہ اپنے آپ کو مہاجر گردانتا تھا اور نہ سندھی۔

والد صاحب کے مطابق چند دنوں میں ہی ان کے بہت سے مقامی سندھی بولنے والے دوست بن گئے تھے۔ یہ دو مختلف زبانوں اور رسم و رواج کے لوگ

ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنے لگے اور سندھ ایک کثیر الثقافت معاشرہ میں تبدیل ہونے لگا۔

عوامی سطح پر سندھی اور اردو بولنے والوں کا ایک دوسرے سے کوئی معاشی وسماجی ٹکراؤ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر سندھ میں جنم لیتی تبدیلی اور اس سے ممکنہ جنم لینے والی عوامی طاقت وہاں کے مضبوط وڈیروں اور پیروں جو سندھ کی سیاسی قوت بھی تھے کو ان کے مستقبل کے لئے خطرہ نظر آ رہی تھی۔ ان ریاستی طاقتوں نے صوبے میں کوئی سنجیدہ اور دوررس عملی اقدامات نہیں کئے کہ جن نے انصار و مہاجر میں بھائی چارے اور ملاپ کو بڑھایا جاتا بلکہ نسلی فرق کو استعمال کر کے اپنی سیاست چمکائی گئی۔ پنجاب میں چودھریوں نے ایک پاکستان پیغام کے بجائے ذات برادریوں کی فوقیت دی اور اسی بنیاد پر عوامی فیصلے کئے گئے۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں قائم نظریہ پاکستان کے خلاف تنظیمیں اندر ہی اندر تقسیم اور حکمرانی کے اصولوں پر کام کرتی رہیں اور لوگوں کے دلوں میں تقسیم اور پاکستان سے منحرف ہونے کے جواز پر اندر ہی اندر کام کرتی رہیں۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں نظریہ پاکستان کی منفی جماعتیں کو جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں کی سرپرستی حاصل رہی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے شہری علاقوں میں رہنے والے جو جاگیرداروں، وڈیروں اور قبائلی سرداروں کے زیرِ اثر نہیں تھے انہوں نے بانی پاکستان کے پیغام، نظریہ پاکستان اور پاکستان کو ایک جمہوری وفلاحی اسلامی ریاست بنانے کے لئے نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ تحریکیں بھی چلائیں مگر اقلیت میں ہونے کے

باعث ان عناصر کی آوازیں پاکستان میں تبدیلی لانے میں کارگر ثابت نہیں ہوسکیں۔ سندھ کے وڈیروں، پنجاب کے جاگیرداروں، بلوچستان اور سرحد کے قبائلی سرداروں نے پاکستان کی سیاست کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان میں جمہوری نظام کو فروغ نہیں ہونے دیا بلکہ آمرانہ طاقتوں، فوج اور افسر شاہی کے ساتھ مل کر پاکستان کو اپنے ذاتی مفاد اور آمرانہ نظام کے مفاد میں استعمال کیا۔

پاکستان کا سب سے بڑا سیاسی قائد گردانے جانے والا ذوالفقار علی بھٹو اپنی ذات میں خود ایک بہت بڑا وڈیرہ تھا اور جس کی پاکستان کی قومی سیاست میں لانے والا پاکستان کا سب سے بڑا فوجی آمر فیلڈ مارشل ایوب خان تھا۔ اور یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک حصہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو پہلا سیاسی لیڈر تھا جس نے اپنے آپ کو پاکستان کا پہلا سویلین کمانڈر ان چیف اور سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنایا۔

☆☆☆

دلچسپ واقعہ ہے کہ کل اِک عزیز دوست
اپنے مفاد پر مجھے قربان کر گیا

(خالدؔ شریف)

میں نے تعصب و تقسیم کا بازار دیکھا؟

حیدرآباد میں 1968 سے 1972 کا نور محمد ہائی اسکول کا زمانہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ نور محمد ہائی اسکول کا شمار حیدرآباد کے اول درجے کے اسکولوں میں ہوتا تھا۔ نور محمد ہائی اسکول میں اردو اور سندھی زبان بولنے والے طلباء کے لئے الگ الگ تین سے چار سیکشن ہوتے تھے۔ اپنے پانچ سالہ ہائی اسکول کے دور میں میں نے کبھی بھی اردو اور سندھی کا تضاد نہیں دیکھا۔ ہمارے دوست مشترک ہوتے تھے۔ اردو اور سندھی بولنے والے ساتھ میں کھیلتے اور پڑھتے تھے۔ بلکہ میری کلاس میں، جو کہ اردو سیکشن کی کلاس تھی، کئی طلبا ایسے تھے جن کی مادری زبان سندھی تھی۔

پھر حالات نے کروٹ لینا شروع کیا۔ شہروں، قصبوں اور صوبوں کی سیاست میں بدلاؤ نظر آیا۔ ادھر مشرقی پاکستان کے لوگ جنہوں نے پاکستان کو بنانے کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا مغربی پاکستان کی پالیسیوں سے خوش نہیں تھے۔ مشرقی پاکستان وہی سرزمین تھی جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد 30 دسمبر 1906 کو ڈھاکہ میں نواب وزیرالملک کی صدارت میں ہوئی تھی اور جس میں نواب سلیم اللہ

نے مسلمانوں کی الگ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے رکھنے کی قرارداد پیش کی تھی جس جماعت کی قیادت تحریک پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح نے کی اور پاکستان کا خواب سچ کر دکھایا۔

1970 کے عام انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں اور شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے (سابق) مشرقی پاکستان میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ اقتدار حاصل کرنے کے نشہ میں دونوں پارٹیوں کے قائدین نے مثبت انداز سے پاکستان کی سالمیت کو سامنے نہیں رکھا۔ میں یہاں پاکستان ٹوٹنے کے تمام سیاق وسباق میں نہیں جانا چاہتا مگر میرا ذہن یہی کہتا ہے کہ اگر پاکستان کی سالمیت کو اقتدار پر ترجیح دی جاتی تو شاید پاکستان کے دو ٹکڑے نہ ہوتے۔ ابھی پاکستان کو بنے صرف 25 سال ہی گزرے تھے کہ پاکستانیت اور مسلمانیت کا جذبہ ختم ہوتا نظر آنے لگا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد اب باقی ماندہ (مغربی) پاکستان میں لوگ پاکستانی اور مسلمان بن کر کم سندھی، پنجابی، بلوچی اور پختون بن کر زیادہ سوچ رہے تھے۔ شاید اب ملک میں تھوڑ پھوڑ اور تیرے میرے کی سیاست شروع کا آغاز ہوگیا تھا۔

جیسا میں نے پہلے بیان کیا مغربی پاکستان کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہاں ساٹھ فیصد سے زیادہ لوگ جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں کے غلام ہیں اور ان جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں نے پاکستان کو صرف اپنے حاکمیت کے تحفظ کی

کنجی سمجھا اور جہاں یہ کنجی کام کرتی نظر نہ آئی انہوں نے پاکستان دشمن تحریکوں اور عناصر کے ساتھ ہاتھ بڑھایا۔ مغربی پاکستان کے ان وڈیروں، جاگیرداروں اور سرداروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے جو پاکستان کے پارلیمان میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کی نمائندگی کررہے تھے مشرقی پاکستان کے قائدین میں مغربی پاکستان کے لئے نفرتیں پیدا کررہے تھے اور جس کا انجام یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ پاکستان بننے کے پہلے 25 سالوں میں مشرقی پاکستان کے عوام نے اپنے حقوق کا نام لے کر پاکستان کو آدھا کردیا اور بنگلادیش کی شکل میں علیحدہ ملک حاصل کرلیا۔ شیخ مجیب الرحمن جو اپنی جوانی میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس لیگ کا اہم رکن تھا اور جس نے پاکستان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا پاکستان سے منحرف ہوگیا اور عوامی لیگ کے بیز تلے بنگالیوں کے حقوق کی جنگ شروع کردی۔

میں اس وقت نویں جماعت میں تھا جب 1971 میں پاکستان کے دوٹکڑے ہوئے اور دنیا کے نقشے پر مشرقی پاکستان بنگلادیش میں تبدیل ہوگیا۔ ہندوستان نے مشرقی پاکستان کی تحریک کے کارکن مکتی باہنی کی ناکام لیکر مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ پھر دونوں سرحدوں (مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان) میں ہندوستان کے ساتھ جنگ ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہندوستان کے جنگی جہاز حملے کی غرض سے آتے تھے۔ ایک جہاز کو پاکستان کے فوجیوں نے اس وقت گولیوں کا نشانہ بنایا جب وہ عین ہماری کالونی کے اوپر پرواز کررہا تھا۔ جہاز میں

سے اچانک آگ کے شعلے اٹھنا شروع ہوگئے اور جہاز آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جہاں فوجی چھاؤنی تھی نیچے کی طرف آنے لگا۔ میں سینکڑوں دوسرے بچوں اور بڑوں کے ساتھ آسمان پر جہاز کو دیکھتا ہوا جہاز کی سمت میں بھاگتا جارہا تھا۔ پھر تقریباً دو کلومیٹر دور فوجی چھاؤنی کے قریب جہاز گر گیا۔ عوام میں اتنا جوش تھا کہ انہوں نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر جہاز کے قریب پہنچنے کی کوشش کی۔ پھر جہاز کے گر جانے کے بعد سینکڑوں لوگ جہاز پر کود پڑے۔ پائیلٹ کو مارا اور جہاز کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر بھاگنے لگے۔ ایک بڑا ٹکڑا میں بھی اٹھا کر گھر لے آیا۔ جو مدتوں ہمارے گھر پر ایک سوغات کے طور پر پڑا رہا۔

سلسلہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر ہی ختم نہیں ہوا۔ پہلی بار مجھے اردو اور سندھی کا فرق اس وقت نظر آیا جب میں 74-1972 کے دوران گورنمنٹ کالج حیدرآباد میں زیرِ تعلیم تھا۔ 1971ء کے شروع میں حیدرآباد میں لسانی ہنگامے ہوئے۔ جن کی وجہ یہ تھی کہ حیدرآباد سیکنڈری اور انٹرمیجیٹ بورڈ نے اعلان کیا کہ مادری زبان اردو بولنے والے طلباء کو 1972 کے امتحانات سندھی زبان میں دینے ہوں گے۔ یہ ہنگامے بڑھ کر سندھ کے اندرونی شہروں اور قصبوں میں پھیل گئے۔ حیدرآباد میں نواب مظفر خان نے اردو بولنے والوں کی طرف سے قیادت کا ذمہ لیا اور بڑے جلسے اور جلوسوں کی قیادت کرتے ہوئے سندھ کی حکومت کے فیصلوں کو مسترد کیا اور اردو بولنے والوں کے مسائل کو مہاجروں کے حقوق کا نام دیا۔ دوسری طرف جئے

سندھ تحریک کے بانی جی ایم سید اور اس کے کارکنوں نے سندھی بولنے والوں کی طرف سے اردو بولنے والوں، جنہیں پناہ گیر کہا جانے لگا کے خلاف بیان بازی شروع کردی۔ غرض دونوں لسانی گروپوں کے سیاسی پنڈتوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور سندھ کے عوام کے درمیان سیاسی لکیر کھینچ کر دو حصوں میں بانٹ دیا۔ جلتی پر تیل کا کام اس وقت کی پاکستان پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت نے کیا۔ پیپلز پارٹی کی سندھ اسمبلی میں اکثریتی جماعت نے جولائی 1972 میں سندھی زبان کا بل پاس کرایا جس کے مطابق سندھی زبان کو سندھ کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ چوتھی جماعت سے بارھویں جماعت تک سندھی اور اردو کو لازمی قرار کر دیا گیا۔ سندھی اور اردو دونوں زبانیں ہی سندھ میں بسنے والوں کی زبانیں تھیں اور دونوں کو سیکھنے یا بولنے سے کسی کو کیا نقصان ہوسکتا تھا، مگر افسوسناک بات یہ تھی کہ زبان کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر خودغرض سیاسی بازیگروں اور اقتدار کے بھوکوں نے سندھ کو لسانی طور پر تقسیم کر دیا اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہی سندھ شہری اور سندھ دیہی کی تقسیم تعلیمی اور حکومتی اداروں میں کوٹہ سسٹم نافذ کر کے کی گئی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ شہری اور دیہی بنیاد پر کوٹہ سسٹم صرف صوبہ سندھ میں ہی نافذ کیا گیا۔ جبکہ پاکستان کے باقی تین صوبوں میں جہاں ساٹھ فیصد سے زیادہ دیہی اور باقی شہری علاقے تھے دیہی اور شہری تفریق نہیں کی گئی۔ کوٹہ سسٹم اور لسانی تقسیم کو سیاسی کارڈ بنا کر سندھ میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اردو اور سندھی دونوں ہی طبقوں کے عام لوگوں کو جو کئی دہائیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے،

کاروبار کرتے اور حتیٰ کہ رشتہ داریوں کے بندھن میں بھی بندھتے نظر آ رہے تھے آپس میں لڑایا گیا اور تعصب بیج بویا گیا۔ کراچی اور حیدرآباد سمیت پورے سندھ میں مہاجر سندھی کے نام پر اس وقت کے بدترین ہنگامے ہوئے۔ یہ وہی سندھ کے عوام تھے جنہوں نے بھارت سے آنے والے مہاجرین کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے تھے اور ان کو کھلے دل سے سندھ میں لبیک کہا تھا۔

دوسری طرف دونوں جانب سے سیاسی بازیگر ہار ماننے کو تیار نہ تھے اور نہ ہی حکومت کوئی لچک دکھا رہی تھی۔ اردو زبان کے دانشور رئیس امروی کا قطعہ اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے' جنگ اخبار نے شہ سرخیوں اور حاشیوں میں شائع کیا۔ جس کے بعد کراچی اور حیدرآباد میں پاکستان کے بدترین ہنگامے اور گھیراؤ جلاؤ کیا گیا۔ نفرت اور تقسیم کا پودا اب اچھی طرح سندھ میں لگا دیا گیا تھا اور سیاسی بازیگر اپنے ہتھکنڈوں کے ذریعے اس کی تیزی سے پرورش کر رہے تھے۔

آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے میرا بارہویں جماعت کا سال بھی تاخیر کی نذر ہوگیا۔ میری اور میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کروں۔ اللہ اللہ کر کے جب بارہویں جماعت کا رزلٹ آیا تو انجینئرنگ کالج میں داخلہ کا سوال پیدا ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کی حکومت میں انجینئرنگ کالج کو مہران یونیورسٹی کا درجہ دے کر حیدرآباد جامشورو سے نواب شاہ کے قریب منتقل کر دیا گیا تھا۔ میرا اِس سے پہلے کبھی نواب شاہ جانا نہیں ہوا تھا۔ عمر اور قد و قامت میں چھوٹا

ہونے کے باعث والدین پریشان تھے کہ میں اکیلا نواب شاہ میں کس طرح رہوں گا اور تعلیم جاری رکھوں گا۔ مگر سرِ دست مسئلہ تو مہران یونیورسٹی میں داخلہ کا تھا۔ میں اپنے دو کالج کے ساتھیوں کے ساتھ بذریعہ بس مہران یونیورسٹی نواب شاہ پہنچا۔ ابھی ہم نوٹس بورڈ کا معائنہ ہی کر رہے تھے کہ کچھ نوجوانوں نے ہمیں آ گھیرا اور سندھی میں سوال کیا جس کے اردو میں معنی تھے۔ تم کون ہو؟ میں اور میرے دوستوں نے یہ سوال زندگی میں پہلے نہیں سنا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی میں نے اردو میں کہا کہ بھائی کیا مطلب ہے آپ کا بس اس کے بعد کیا تھا، ہمیں تینوں کو دس سے پندرہ لڑکوں نے گھیر کر مارنا شروع کر دیا۔ مارتے ہوئے ہماری تلاشی لی گئی۔ ہم سے پیسے، گھڑیاں اور کاغذات چھین لئے گئے۔ پھر ہم کسی نہ کسی طرح سے بلڈنگ سے بھاگ نکلے تو ہمارا پیچھا ہائی وے تک کیا گیا۔ قسمت اچھی تھی حیدرآباد جانے والی بس آتی نظر آئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو تھوڑا آہستہ کیا اور ہم جھٹ سے بس میں سوار ہو گئے اللہ کا شکر ادا کیا۔ بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے بتایا کہ اس طرح کا ڈرامہ وہ آئے دن دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی تو بس کو روکنا بھی ان کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ بس میں سوار ہر آدمی ہم سے ایک ہی سوال کر رہا تھا کہ اگر تمھیں جان پیاری ہے تو یہاں کیوں پڑھنے آنا چاہتے ہو۔ گھر پہنچ کر جب والدہ اور والد نے میری حالت دیکھی اور ان کو سارا ماجرہ سنایا تو والدہ کے آنسو آ گئے اور پھر میں بھی رونے لگا۔ مجھے میرے انجینئر کی ڈگری حاصل کرنے کے خواب ادھورے ہوتے نظر آ رہے تھے۔ والد صاحب نے کہا کہ وہ

میرے نواب شاہ میں داخلہ اور رہنے کا کوئی اور راستہ نکالتے ہیں مگر والدہ نے منع کر دیا کہ وہ مجھے اب کبھی نواب شاہ نہیں بھیجیں گی۔ بالآخر والد نے اپنے ایک دو کالج کے پروفیسر دوستوں سے مشورہ کیا اور مجھے سندھ یونیورسٹی میں بی ایس آنرز (فزکس) میں داخلہ دلوا دیا۔ سندھ یونیورسٹی میں داخلہ تو لے لیا مگر میرے ذہن سے انجینئرنگ میں نہ جانے کی وجہ ہمیشہ پریشان کرتی رہی۔ میرے ساتھ ہونے والا المیہ کوئی انوکھا نہیں تھا ہر سال سینکڑوں نوجوان اس خوف سے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں نہیں جاتے کہ وہاں پر ان کی جان محفوظ نظر نہیں آتی۔ یہ وہ نوجوان طبقہ ہے جو پاکستانی ہونے کے باوجود اپنی شناخت کے قیدی ہیں۔

☆☆☆

انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہمسفر کہاں ہے

(ڈاکٹر بشیر بدرؔ)

مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش اور باقی پاکستان میں مزید تفریق!

1971 میں پاکستان آدھا ہوگیا۔ ایک عام محبِ وطن پاکستانی کو بچے ہوئے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں اس وقت بھی تشویش تھی اور سقوطِ ڈھاکہ کے 45 سال بعد آج بھی لوگ پاکستان کی سلامتی کے لئے دعا گو ہیں۔ لوگ اس وقت حالات سے ناخوش تھے مگر پاکستان کی سوچ زندہ تھی۔ تعصب، لسانیت، بے ایمانی اور ظلم اس وقت بھی موجود تھے مگر ان کے خلاف آواز اٹھانے والے باضمیر لوگ بھی موجود تھے۔ لوگ برائی کو برائی اور بے ایمانی کو بے ایمانی کہتے تھے۔ سیاسی بازیگر اس وقت بھی تھے مگر سرِ عام جھوٹ بولنے سے ڈرتے تھے۔ انصاف اس وقت بھی بکتا تھا مگر انصاف کے منصب پر بیٹھے منصف سیاسی بازیگروں کے ساتھ سڑکوں پر حکومت کے خلاف احتجاج کرتے نظر نہیں آتے تھے۔ پاکستان کے جھنڈے اس وقت بھی سندھ، بلوچستان اور سرحد کے تعلیمی اداروں میں نظریۂ پاکستان کے دُشمن جلاتے تھے مگر پاکستان کی عزت بڑی بڑی شاہراہوں پر سرعام نیلام نہیں کی جاتی تھی۔ مذہبی جلسے

جلوس اس وقت بھی بڑی شان وشوکت سے نکالے جاتے تھے مگر اسلام اور جہاد کے نام پر لوگ مذہبی مقامات، درسگاہوں اور عوامی جگہوں پر بم باندھ کر بے گناہوں کی جانوں سے نہیں کھیلتے تھے مگر صحافت ایک معتبر شعبہ سمجھا جاتا تھا۔ سیاسی پارٹیاں اس وقت بھی صحافت کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتی تھیں مگر صحافی اپنی صحافت پر قومی ومعاشرتی ذمہ داریوں کو قربان نہیں کرتے تھے۔ بلیک میلنگ، جھوٹ اور ہیرا پھیری کو صحافت کا نام نہیں دیا جاتا تھا۔ محلہ کے بدمعاش چاقو اور چھریاں ضرور رکھتے تھے مگر مہلک اسلحہ رکھنا اور کھلے عام استعمال کرنا لوگوں کے تصور سے باہر تھا۔ انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والوں کے بارے میں لوگوں کی رائے اس وقت بھی اچھی نہیں تھی مگر ان اداروں سے لوگ امن وامان قائم رکھنے کی امید ضرور رکھتے تھے۔

جب میں اپنی ذاتی زندگی میں ہونے والے واقعات اور ماضی کے ان معاشرتی حالات کے دریچوں میں جھانکتا ہوں جو میرے مشاہدے اور تجربات میں آئے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ شاید ہم ایک آزاد ریاست کے اہل ہی نہیں تھے۔ ہم نے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اور عظیم ریاست کے خواب دیکھے تھے وہ سب جذبات کا ایک بلبلہ تھا جو رفتہ رفتہ صوبائیت، لسانیت اور گروہ بندی کی نظر ہوگیا۔ مسلمانیت اور اسلام کا وہ جذبہ جو پاکستان کی جدوجہد میں لوگوں میں تھا پاکستان کے بعد ان لوگوں میں تو نظر آیا جنہوں نے عملی طور پر پاکستان کے لئے قربانیاں دیں تھیں اور جو پاکستان کے نظریہ، مقاصد اور ان کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے مگر ان جاگیرداروں، وڈیروں اور قبائلی سرداروں نے جو پاکستان کے نظریہ کے ساتھ صرف

اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے شامل ہوئے تھے پاکستان کو صرف اپنی طاقت اور خاندانی وراثت کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا۔ ان ریاستی طاقتوں نے پاکستان کا نام تو لیا مگر عملی طور پر متحدہ پاکستان پر صوبائیت کو فوقیت دی۔ پاکستان کا نام لیکر اخوت اور اتحاد کی سیاسی جمع خرچ تو کی گئی مگر عملی طور پر ایسی حرکتیں کی گئیں کہ عوام پاکستانی بن کر نہیں بلکہ سندھی، مہاجر، پنجابی، بلوچی اور پختون بن کر سوچیں۔

آج جب میں پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کا تجزیہ کرتا ہوں تو اللہ سے یہ ہی دعا مانگتا ہوں کہ اے اللہ میری پہلی شناخت پاکستان کو قائم ودائم رکھے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اللہ بلاوجہ کچھ نہیں کرتا، ہر چیز کے پیچھے اس کے اسباب اور محرکات ہوتے ہیں۔ آج پاکستان کا معاشی وسیاسی استحکام پاکستان کو برباد کرنے والوں کے ہاتھوں میں کیوں ہے۔ دیگ میں پکنے والے چاولوں کے ایک دانے کو دیکھ کر ہی پکانے والا دیگ میں پکنے والے کھانے کا اندازہ کرتا ہے۔ آج پاکستان دنیا کے لئے ایک سوال بن کر رہ گیا ہے۔

میں پاکستان میں نہیں اور نہ ہی میرے بیوی بچے پاکستان میں رہتے ہیں، ماں باپ زندہ نہیں رہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے تمام بہن بھائی تعلیم حاصل کر کے یا تو دنیا کے مختلف ممالک میں عزت، چین وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن جو جو پاکستان میں ہیں ان کے بارے میں ہر وقت ایک خدشہ لگا رہتا ہے۔ میرے رشتہ دار، بزرگ، پرانے دوست احباب میں بہت سے پاکستان میں ہی بستے ہیں لہٰذا جب بھی ان سے میری پاکستان کے حوالے سے بات چیت ہوتی ہے تو ان کے جوابات میں

ایک مایوسی اور غیر یقینی کی کیفیت پاتا ہوں۔

میرے زمانہ طالبعلمی کے کئی ساتھی پاکستان میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، ان کے پاس دولت ہے، گاڑی ہے، گھر میں نوکر چاکر ہیں باہر عہدہ کا پاور ہے مگر یہ سب مجھ سے بیرونِ ملک مقیم ہونے کے راستے پوچھتے ہیں۔ میرا ذہن پھر انتشار کا شکار ہو جاتا ہے کہ جس ملک سے میں اتنا پیار کرتا ہوں کہ وہاں اپنی باقی زندگی گزارنے کے راستے ڈھونڈتا ہوں اس میں رہنے والے اس ملک سے اتنے بیزار کیوں ہیں اور پاکستان سے کیوں فرار چاہتے ہیں؟

میرے لئے سب سے اہم بات کہ میرے اور میرے جیسے لاکھوں لوگوں کے ماں باپ نے اپنے خون کے نذرانے دے کر پاکستان کی تعمیر کی تھی۔ آج پاکستان کے کروڑوں لوگ اپنے مستقبل کو ایک بند گلی کی طرح پاتے ہیں، اپنی شناخت کو جرم سمجھتے ہیں اور اس میں قید پاتے ہیں۔ آج پاکستان میں بسنے والا عام محب وطن پاکستان سے پیار تو ضرور کرتا ہے مگر اپنی زندگی اور عزت بچانے کی خاطر پاکستان سے نکلنے کے لئے ایک موقع کی تلاش میں آس لگائے بیٹھا ہے۔

پاکستان چھوڑنے کو شاید میرا ذہن کبھی راضی نہیں ہوتا اگر یکے بعد دیگرے زندگی کے ہر قدم پر مجھے یہ سوچنے پر مجبور نہ کیا گیا ہوتا کہ آخر میرا قصور کیا ہے۔ میرے ہی درمیان رہنے والے لوگ آخر کیوں مجھے پاکستانی ماننے کو تیار نہیں۔ کیوں مجھ سے زندگی کے اہم موڑ پر یہ پوچھا جاتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میرے ماں باپ کون ہیں؟ میرا باپ کہاں پیدا ہوا تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں شاید لاکھ کوشش کرنے کے

باوجود بھی اپنے ذہن سے وہ حادثہ نہیں بھول پاؤں جو آج سے تین دہائیوں پہلے ہوا۔

مختصراً تفصیل کچھ یوں ہے کہ مجھے اپنی بی ایس آنرز، اور ایم ایس سی کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی اصل اسناد کی ضرورت تھی میں 1985 میں جب کراچی میں 18 گریڈ کا ایک بڑے محکمہ میں افسر تھا، کراچی سے سندھ یونیورسٹی جامشورو گیا، ایڈمنسٹریشن بلڈنگ سے ڈگریاں ہاتھ میں لئے خوشی خوشی واپس کراچی کے لئے بس لینے سپر پائی وے کی طرف جارہا تھا کہ چندنوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور ان میں سے ایک نے میرے ماتھے پر پستول رکھ کر سندھی زبان میں کہا کہ بابا یہ کاغذات کا لفافہ ہاتھ میں ہے ہمیں دے دو، میں بہت جذباتی ہوگیا اور انکار کیا جس پر انہوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کردیا، میں مار کھاتا گیا اور موت سامنے نظر بھی آرہی تھی دور دور تک کوئی اور بچانے والا بھی نظر نہیں آرہا تھا اور موت اور میرے درمیان پستول اور صرف گھوڑا دبانے کی دیر تھی مگر میرا ذہن موت کے لئے تیار تھا مگر اپنی ڈگریاں دینے کو تیار نہ تھا۔ خیر میں مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگیا۔ اِس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ میں حیدرآباد شہر جانے والی بس میں سوار ہوں، جسم پر قمیض نہ تھی، ماتھے سے خون بہہ رہا تھا، منہ اور جسم کے مختلف حصوں پر زخم تھے۔ میں نے مسافروں سے پوچھا مجھے بس میں کون لایا تو کسی نے کہا کہ ایک شاید یونیورسٹی کے پروفیسر تھے جو کار میں لائے تھے اور تمہیں بس میں سوار کرا کر چلے گئے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ مگر اِس واقع کے نشانات نہ صرف میرے جسم پر آج بھی ہیں بلکہ پھٹی ہوئی ڈگریاں میرے پاس جب تک ہیں یہ واقع اور اس سے جڑے نظام کو میں اُس

وقت تک نہیں بھول پاؤں گا جب تک یہ نظام پاکستان سے ختم نہیں ہوتا۔ میرا ساتھ ہونے والا یہ واقعہ کوئی منفرد واقع نہیں ہزاروں نوجوانوں کے ساتھ سندھ، بلوچستان اور جیبر پختون خواہ کے تعلیمی اداروں میں اِس قسم کے واقعات زبان، صوبہ اور فرقہ کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ کیا ہم سب ایک آزاد پاکستانی مملکت میں اپنی اپنی شناخت کے قیدی بن کر رہیں گے؟

☆☆☆

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اِک شخص
ہُوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اِک شخص

(عبیداللہ علیمؔ)

سندھ کے تعلیمی ادارے تعصب کی آماجگاہیں، پھر الطاف حسین کی آمد

اردو زبان بولنے والے طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے سندھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا کسی جہاد سے کم نہ تھا۔ کب کس وقت کچھ نوجوانوں کا گروہ اسلحہ کی نمائش کرتا ہوا آئے اور مجھ سے میری شناخت پوچھنے کے بعد مارنا شروع کردے۔ چار سال سے زیادہ عرصہ کے دوران سندھ یونیورسٹی میں کئی مرتبہ سندھو دیش تحریک کے نوجوانوں کے ہاتھوں مار کھائی مگر کوئی دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا، ڈگری تو بہرحال مکمل کرنی تھی۔ جہاں تک سندھ یونیورسٹی کے استادوں کا تعلق تھا گو کہ نوے فیصد سندھی بولنے والے تھے مگر اکثریت میں سب اچھے اور تعصب سے پاک تھے۔ اچھے اور محنتی طلباء کو چاہے وہ اردو بولنے والا ہو یا سندھی سراہتے تھے۔ اللہ کے کرم سے اپنی پڑھائی میں نمایاں کارکردگی حاصل کی۔ تین سالہ آنرز کی ڈگری میں فیکلٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ماسٹر ڈگری میں کوٹہ سسٹم تھا مگر نمبر 1 ہونے کی وجہ سے اپنی پسند کی ماسٹر ڈگری میں جانے کا موقع ملا اور یوں کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں ماسٹر کیا اور اس

میں بھی ڈیپارٹمنٹ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ سندھ یونیورسٹی میں وقت گزارنے کے دوران پاکستان اور پاکستان کے نظریہ کے مخالفین کی سرگرمیاں قریب سے دیکھیں۔ دراصل سندھ یونیورسٹی میں مارپیٹ اور متعصب سسٹم کا ذمہ دار یونیورسٹی کی انتظامیہ تھی۔ اُس زمانے میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر شیخ ایاز تھا۔ جو کہ ایک سندھی قوم پرست ادیب و شاعر تھا۔ اس کا سندھی قوم پرست گیت کا مصرعہ مجھے آج بھی یاد ہے، ''مرسوں مرسوں سندھ نہ دے سوں، یعنی مرجائیں گے مرجائیں گے مگر سندھ نہیں دیں گے۔ سندھو دیش تحریک کے نوجوان پاکستان یا سندھ کے قومی دنوں پر یا سندھ یونیورسٹی میں پاکستان کا جھنڈا جلاتے تھے۔ محمد بن قاسم کو سندھ کا لٹیرا اور راجہ داہر کو سندھ کا ہیرو کہا جاتا تھا۔ اردو بولنے والوں کو پناہ گیر یا مکڑ کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ پناگیر یا مکڑ نہ کھپن (نہیں چاہیے) کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ اگر کوئی سندھی تحریک کا مشہور رکن یونیورسٹی کیمپس کی بس میں سوار ہوگیا اور کوئی سیٹ خالی نہیں پائی تو کسی بھی اردو بولنے والے کو اٹھا دیا جاتا تھا۔ مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ جیئے سندھ کے کارکن اسلحہ کی نمائش کرتے یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں داخل ہوتے۔ پھر کسی بھی اردو بولنے والے کو پکڑ کر اس سے سندھی زبان میں سوال کرتے 'تم کون ہو'۔ اردو میں جواب دینے پر تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش ہوجاتی۔ دوسرے لڑکے یہ منظر خاموشی سے دیکھتے رہتے یا پھر وہاں سے بھاگنے کی تیاری کرتے۔ کون جانے کس کا نمبر کب آتا ہے ہر اردو بولنے والے کے ذہن میں یہ خوف رہتا تھا۔ کیونکہ یونیورسٹی شہر سے بیس کلومیٹر سے بھی زیادہ دور حیدرآباد شہر سے دور تھی

اور شہر واپسی کا راستہ صرف یونیورسٹی کی بسیں تھیں لہٰذا ایک مرتبہ یونیورسٹی پہنچنے کے بعد حیدرآباد شہر کے لڑکے جئے سندھ کے کارکنوں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ انتظامیہ یہ سب کچھ خاموش تماشائی بنے دیکھتی رہتی تھی۔ جئے سندھ کے کارکن اردو بولنے والوں کو ان کے ناموں سے نہیں بلاتے تھے بلکہ ان کو 'مکڑ' کہا جاتا تھا۔ جس کے معنی ہیں 'کیڑے'۔ اور لگتا بھی یوں ہی تھا جیسے اردو بولنے والے کیڑے مکوڑے ہیں جن کو کبھی بھی مسل کر مار دیا جاسکتا ہو۔ یہ وہ مناظر تھے جو میرے لئے معمول کا حصہ بن گئے تھے۔ 1978 کی بات ہے میں اپنی ڈگری کے آخری سال میں تھا۔ یونیورسٹی میں جئے سندھ کے کارکنوں نے اردو بولنے والوں سے مار پیٹ کے واقعات بڑھتے جارہے تھے۔ ایک اردو بولنے والے لڑکے کو کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں مار مار کر لہولہان کر دیا اور اس پر تیزاب پھینکنے کی کوشش کی گئی۔ واضح رہے کہ وہ ضیاالحق کا فوجی دور تھا۔ سندھو دیش کے کارکنوں کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں سے تنگ آ کر ہمارے کچھ ساتھیوں نے جو اب یونیورسٹی میں کافی سینئر طلبا تھے اور حالات کا اچھی طرح تجربہ رکھتے تھے، فیصلہ کیا کہ ہم حیدرآباد جا کر وہاں کے فوجی حکام سے ہمارے ساتھ ہونے والے مظالم کی شکایت کریں۔ ان ساتھیوں میں سے کچھ کے نام مجھے اچھی طرح یاد ہیں، افضل گجر، رحمان راجپوت، سمیع سندھو، خسرو پرویز، طارق، مختار عاقل، یوسف، ساجد، عابد، انور عارف وغیرہ۔ چند سے میرا اب بھی کبھی کبھار رابطہ رہتا ہے، کچھ میری طرح پاکستان سے ہجرت کر گئے اور چند کے بارے میں مجھے معلوم ہے پاکستان میں مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں۔ بہرحال ہم سندھ

یونیورسٹی سے کئی بسوں میں سوار ہو کر تقریباً کئی سو طلباء اور طالبات کے ساتھ حیدرآباد میں فوجی چھاؤنی پہنچے۔ فوجی چھاؤنی میں بسوں میں طلباء کو دیکھ کر فوجیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پھر ہم لوگ حیدرآباد کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جو برگیڈیئر کے عہدہ پر تھے اور جس کا نام شاید مسعود الحسن تھا کے آفس پہنچے۔ ہمارے چار ساتھیوں نے برگیڈیئر صاحب سے ملاقات کی۔ جب برگیڈیئر صاحب کو سارا ماجرا سنایا تو ان کو ہمارے واقعات ایک کہانی لگے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ فوجی انتظامیہ کو سندھ یونیورسٹی میں کیا کچھ ہو رہا ہے کچھ نہیں معلوم۔ بہرحال ایک لمبی بحث اور سوال و جوابات کے بعد اس برگیڈیئر صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ اگر ایسا کچھ ہوتا ہے اور یونیورسٹی کی انتظامیہ بھی کچھ نہیں کرتی تو ہم لوگ اپنا نمائندہ گروپ بنا کر طلبا کی یونین کے الیکشن میں حصہ لیں اور پھر باقاعدہ طور پر حکومت کے اداروں سے ہمارے ساتھ ہونے والے مظالم پر احتجاج کریں۔ برگیڈیئر صاحب نے ہمیں یقین دلایا کہ فوجی انتظامیہ غیر سندھی زبان بولنے والے طلباء کو مکمل تحفظ فراہم کرے گی اور اس سلسلہ میں یونیورسٹی کی انتظامیہ سے بات چیت کی جائے گی۔ ساتھ ہی ہمیں یہ مشورہ دیا گیا کہ آنے والے طلباء کے الیکشن میں ہم لوگ اپنے نمائندے کھڑے کریں۔ گو کہ سندھی بولنے والے اور غیر سندھی بولنے والے طلبا کا آدھے آدھے کا تناسب تھا مگر وہاں اسلحہ کی نوک پر سندھو دیش کے طلبا سب پر حکومت کرتے تھے۔ بہرحال سندھ یونیورسٹی میں تاریخی الیکشن ہوئے۔ فوجیوں نے حیدرآباد شہر سے لیکر جامشورو جو کہ تقریباً پندرہ سے بیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا اور یونیورسٹی کے اندر تک فوج تعینات کی۔

حیدرآباد شہر سے یونیورسٹی تک اسپیشل بسیں چلائی گئیں جن کی نگرانی فوجی کر رہے تھے۔طلبا وطالبات سب سے اپیل کی گئی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں یونیورسٹی جا کر اپنی پسند کے نمائندوں کو ووٹ دیں۔غیر سندھی زبان بولنے والوں کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں ڈیپارٹمینٹل الیکشن میں اپنے فزکس ڈیپارٹمنٹ سے ایک سندھی بولنے والے کے مقابلے میں جوائنٹ کھڑا ہوا تھا۔ جبکہ یونیورسٹی کے جنرل الیکشن میں ہم نے جوائنٹ اور جنرل سیکرٹری کے امیدوار کھڑے کئے۔مختصر خلاصہ یہ کہ ہمارا جوائنٹ سیکرٹری جنرل الیکشن جیت گیا۔ میں اپنا ڈیپارٹمینٹل الیکشن جیت گیا۔ ایسا جامشورو یونیورسٹی کیمپس میں پہلی مرتبہ ہوا سندھودیش کے کارکن ہماری جانوں کے دشمن ہوگئے۔ مجھے میرے ڈیپارٹمنٹ کے اندر جیئے سندھ تحریک کے کچھ لڑکوں نے اسلحہ کی نوک پر آ گھیرا اور ساتھ چلنے کے لئے کہا۔منع کرنے پر کافی مارا پھر کچھ سندھی بولنے والے دوستوں نے مارنے والوں سے منت سماجت کر کے مجھے چھڑایا۔ جوائنٹ سیکرٹری کو اور ہمارے ایک اور سرگرم کارکن کو کچھ ہی دنوں کے فرق سے اس قدر مار کر زخمی کیا کہ دونوں کئی دِن تک ہسپتال میں رہے اور پھر جان سے مارنے کی دھمکیوں کی وجہ سے دونوں کو یونیورسٹی چھوڑنی پڑی۔ 1977 میں مَیں نے فزکس میں آنرز کیا۔ میں اردو بولنے والے طلباء میں ان چند طلباء میں سے تھا جس نے سائنس فیکلٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ پھر 1978 میں میں نے اپنے کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ یہاں میں یہ بات بتاتا چلوں کہ میرے تھیوری کے تمام مضامین میں A گریڈ مارکس تھے مگر پریکٹیکل میں B گریڈ دیدیا گیا جس سے

میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے سے صرف چند نمبروں سے رہ گیا۔

1978 کے دوران ہمیں حیدرآباد میں یہ خبریں مل رہی تھیں کہ جامعہ کراچی میں کچھ نوجوانوں نے آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس فیڈریشن بنائی ہے۔ میرے ایک اور ساتھی جس کا نام میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور جس نے بعد میں پاکستان نیوی جوائن کر لی اور شاید اب نیوی میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں یا ریٹائرڈ ہو گئے ہوں، نے اس فیڈریشن کے بارے میں جاننے میں بہت دلچسپی لی کیونکہ ہم سب کا مقصد کسی نہ کسی طرح سے ہمارے ساتھ ہونے والے مظالم پر زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنا تھی۔ بہرحال ایک روز اس ساتھی نے ہمیں یونیورسٹی میں اطلاع دی کہ جامعہ کراچی سے آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانی اور ان کے چند ساتھی حیدرآباد آئے ہیں اور ہم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اور میرے ساتھیوں نے ہمارے اس ساتھی کی دعوت پر کوئی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ بہرحال اِس نے ہمارے ایک اور ساتھی کے گھر پر جو لطیف آباد نمبر 8 میں واقع تھا۔ کراچی سے آئے اِن طلباء کے ساتھ ایک کارنر میٹنگ منعقد کی۔ میں نے اپنے ایک ساتھی، جو میرا پڑوسی بھی تھا کے ساتھ اِس کارنر میٹنگ میں شرکت کی۔ اِس میٹنگ میں ایم سی کے فرائض میں نے ادا کئے اور آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانی الطاف حسین اور اس کے چند ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ الطاف حسین کے ساتھ اور کون کون تھا مجھے دھندلا دھندلا سا یاد ہے۔ بہرحال ہمارے میزبان ساتھی نے مجھ سے کہا کہ میں سندھ یونیورسٹی میں جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اس پر ایک خلاصہ پیش کروں۔ اس میٹنگ میں تقریباً

بیس سے پچیس کے قریب لڑکے موجود تھے۔ میں نے ایک مختصر سی تقریر میں حیدرآباد کے تعلیمی اداروں بالخصوص سندھ یونیورسٹی میں غیر سندھی زبان بولنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے بتایا اور ہونے والے چند واقعات کا ذکر کیا۔ پھر الطاف حسین نے اپنی مہاجر فیڈریشن کے بارے میں بتایا۔ الطاف حسین نے اپنی فیڈریشن اور خاص طور پر کراچی میں مہاجروں کے ساتھ درپیش مسائل اور اپنی فیڈریشن کے مقاصد بتائے۔ جس کا لبِ لباب مہاجروں کے حقوق کے لئے کچھ کرنا تھا۔ کیونکہ الطاف حسین کی ساری تقریر کا محور مہاجر تھے اور شکایات کا رُخ پنجاب اور پنجابی بولنے والے تھے لہٰذا ہمیں الطاف حسین کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آئی۔ کیونکہ اس وقت حیدرآباد میں ہمارے مسائل کچھ اور تھے۔ ہمیں مسئلہ صرف سندھو دیش کے نوجوانوں سے تھا جو ہمیں سکون سے سندھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ ہمارے ساتھ پنجابی، پٹھان، سرائیکی اور اردو بولنے والے سب تھے اور ہم میں آپس میں کبھی کوئی تفریق نظر نہیں آئی۔ حتیٰ کہ اس محفل میں بھی آدھے لڑکے پنجابی بولنے والے تھے۔ لہٰذا تقاریر کے بعد مجھ سمیت ہمارے ساتھی الطاف حسین اور اس کے ساتھ آئے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ بہت دیر گئے تک بحث اور مباحثہ کرتے رہے۔ اِس میٹنگ کے میزبان ساتھی نے ہمیں بعد میں کئی مرتبہ مہاجر اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہونے کی دعوت دی مگر میں اور میرے کئی ساتھیوں نے مہاجر اسٹوڈنٹس کے ایجنڈے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس میٹنگ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اِس میں الطاف حسین نے سندھ کی تقسیم، مہاجرستان اور

سندھ دیش کی بات کی اور ایک ڈائری سے ایک سندھ کا نقشہ بھی دکھایا جس میں سندھ کو دو حصوں مہاجرستان اور سندھ دیش میں تقسیم کیا گیا۔ ان چیزوں پر ہم حیران تھے کیونکہ یہ تمام باتیں بحیثیت طلبا ہماری بساط سے باہر تھیں اور ہمارے مسئلے اِس حد تک نہیں تھے کہ ہم سندھ کی تقسیم تک سوچتے۔ بہرحال میٹنگ ختم ہوئی، ہمارے کچھ ساتھی اس کے بعد مہاجر اسٹوڈنٹس میں شامل ہو گئے لیکن میں اور ہمارے بیشتر ساتھیوں کی اس کے بعد پھر کبھی نہ الطاف حسین سے ملاقات ہوئی اور نہ ہی اس کی تنظیم میں شامل ہوئے بلکہ اصولی طور پر مخالفت کی۔

1979 میں پھر میں نوکری کی تلاش میں کراچی آ گیا مگر حیدرآباد ہر ہفتہ آنا رہتا تھا۔ پھر 1984ء میں اچانک الطاف حسین مہاجر قومی موومنٹ کے بانی کے طور پر اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین سالوں میں الطاف حسین اور اس کی مہاجر قومی موومنٹ نے کراچی سمیت سندھ بھر میں ایک نئی سیاسی قوت کو جنم دیا۔

☆☆☆

مِرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا

(فیضؔ)

سرکاری اداروں میں فوجیوں کی مداخلت اور سندھ میں نفرتوں کے بازار

اگست 1980 کو کراچی پورٹ ٹرسٹ میں گریڈ 17 میں کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ میں نوکری مل گئی۔ میں کراچی پورٹ میں سب سے کم عمر آفیسرز میں سے ایک تھا۔ کمپیوٹر کا پاکستان میں نیا نیا زمانہ تھا اور ملک میں زیادہ ماہر نہیں تھے۔ اللہ کا کرم تھا کہ بہت محنت سے کراچی پورٹ میں کام کیا اور کئی اہم سسٹم کمپیوٹرائز کئے۔ تین سال بعد ہی جب مجھے پاکستان کی ایک بڑی کمپنی اور پھر دوبئی کی ایک کمپنی کی زیادہ اچھی آفر آئی تو کراچی پورٹ ٹرسٹ نے مجھے اگست 1985 کو 18 ویں گریڈ میں ترقی دے دی۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں نوکری کرنے اور کراچی میں رہنے کے بعد کچھ اور نئے تجربات سامنے آئے۔ یوں تو حکومت فوجیوں کی تھی۔ اس وقت تک میں نے صرف سنا تھا کہ پاکستان میں فوجی جرنیل، وڈیروں، جاگیرداروں، سرداروں کا ایک اکٹھ ہے اور اپنے مشترکہ مفاد کی وجہ سے ایک دوسرے کی سنتے ہیں۔ یہ وہ وڈیرے، جاگیردار اور قبائلی سردار ہیں جو بدقسمتی سے سیاسی پارٹیوں کے بھی کرتا دھرتا ہیں۔ کس طرح سے

پاکستان کے بیوروکریٹس، فوجی اور جاگیردار ایک دوسرے کی سنتے ہیں یہ میں نے کراچی آ کر اور حکومت میں نوکری کر کے دیکھا۔

ایک دِن میرے منیجر نے جو بیس گریڈ کے آفیسر تھے اور جن کا تعلق پنجاب سے تھا اپنے آفس میں مجھے بلا کر ایک نوجوان سے ملایا۔ میں یہاں اِس نوجوان اور منیجر کے ناموں کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اس نوجوان کا تعلق لاڑکانہ سے تھا اور اس نے بھی کمپیوٹر میں ماسٹر ڈگری سندھ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ایک ہی یونیورسٹی سے تعلق ہونے سے یہ نوجوان مجھ سے مل کر خوش ہوا۔ منیجر نے اس کو میرے ماتحت کر دیا۔ اِس نوجوان کا تقرر 16 گریڈ میں ہوا تھا۔ بات چیت کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ اس کی تقرری ممتاز علی بھٹو کی کراچی پورٹ ٹرسٹ کے اس وقت کے چیئرمین ایم آئی ارشد کے ذریعے ہوئی ہے جو جنرل ضیاالحق کے سمدھی ہوتے تھے۔ حالانکہ ممتاز علی بھٹو اس وقت نظر بند تھے۔

یہ جنرل ضیاالحق مرحوم کا فوجی دور تھا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں تھیں مگر اسی دوران 1986 کو مہاجر قومی موومنٹ کا ایک تاریخی جلسہ نشتر پارک کراچی میں ہوا۔ مجھے الطاف حسین کے اس نئے سیاسی رنگ کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ میں الطاف حسین اور مہاجر قومی موومنٹ کے اس جلسہ کو دیکھنے گیا۔ کراچی کے کونے کونے سے نوجوان بسوں، کاروں اور پیدل نشتر پارک میں جمع ہو رہے تھے۔ زیادہ نوجوانوں نے کُرتے، پاجامے پہنے ہوئے تھے اور سفید بال اور سبز رنگ سے بنے مہاجر قومی

موومنٹ کے جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔ کراچی کے نوجوانوں کا اِس روپ اور ایک نئی سیاسی سوچ پر میری عقل دنگ رہ گئی۔ نوجوانوں میں بے انتہا جوش نظر آ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ پہاڑوں کی تہہ میں عرصہ دراز سے پک رہا لاوا آج آتش فشاں بن کر پھٹا ہے۔ ساتھ ہی کراچی کے ان نوجوانوں کے ہاتھوں میں جن کے پاس قلم ہوتا تھا پہلی مرتبہ بندوقیں دیکھیں۔ اس سے پہلے میں نے بندوقیں سندھودیش اور جئے سندھ کے تحریکی کارکنوں کے ہاتھوں میں دیکھی تھیں۔ جلسے سے الطاف حسین اور اس کے تحریکی ساتھیوں نے بڑی جوشیلی تقریریں کیں۔ الطاف حسین کی تقریر کا محور مہاجروں کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں اور متعصب برتاؤ تھا۔ الطاف حسین کا نشانہ خاص طور پر پنجاب تھا جبکہ جئے سندھ یا سندھودیش کے حامیوں کی طرف سے ہونے والی سندھ میں زیادتیوں کی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ غور کرنے پر اور رنگ ولباس دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ الطاف حسین کے اسٹیج کے چاروں طرف کھڑے ہوئے گارڈ سندھی نوجوان لگ رہے تھے۔ جو کہ میرے لئے ایک اچنبھہ سے کم نہیں تھا۔ کل تک جو لوگ اردو بولنے والوں کے خون کے پیاسے تھے آج وہ اردو بولنے والوں کی نمائندگی کرنے والے کے محافظ کیسے ہو سکتے تھے۔ پھر اخبارات میں جئے سندھ تحریک کے بانی اور سربراہ جی ایم سید کے بیانات الطاف حسین کی حمایت میں شائع ہوئے۔ ایک موقع پر جی ایم سید نے یہ بھی کہا کہ جو کام وہ سالوں میں نہ کر پائے الطاف حسین نے تھوڑے عرصہ میں کر دکھایا۔ میرے تجزیہ کے مطابق جئے ایم سید اور

ان کی جئے سندھ تحریک کا ایک مقصد یہ تھا کہ اردو بولنے والوں کو کبھی بھی سندھ کے مقامی کلچر میں ضم نہ ہونے دیا جائے۔ ان کو ہمیشہ مہاجر بنا کر ہی رکھا جائے اور اب کیونکہ اردو بولنے والوں کو مہاجر قوم کا نعرہ دیدیا گیا تھا جس سے شاید جی ایم سید کے خواب پورے ہوتے نظر آ رہے تھے، سندھ میں بدلتی ہوئی سیاست سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کبھی دل یہ کہتا تھا کہ یہ اردو بولنے والوں کے ساتھ کوئی بہت بڑی سازش ہو رہی ہے اور کبھی یہ کہ شاید الطاف حسین کی جانب سے اٹھائی ہوئی آواز کے زور سے سندھ میں ہونے والی تفریق کو ریاستی طاقتیں ختم کر دیں۔ مگر ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا تھا کہ اردو بولنے والے جن کو مہاجر، پناہ گیر، تلیر، مکڑ اور بھیا کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے فطری طور پر پاکستان میں بسنے والی آبائی قوموں سے سیاسی و معاشرتی طور پر الگ سوچ رکھتے ہیں۔ یہ ہی وہ واحد پاکستان میں بسنے والا طبقہ ہے جو وڈیروں، جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے کنٹرول میں نہیں ہے۔ یہ ہی وہ واحد طبقہ ہے جس کا رشتہ کسی صوبہ کی بجائے صرف پاکستان سے ہے۔ جہاں تک سندھ کا تعلق ہے اردو بولنے والوں کو اب سندھ سے کسی اور سرزمین میں ہجرت نہیں کرنی ان کا جینا مرنا سندھ اور پاکستان میں ہے۔ لہٰذا سندھ اور پاکستان سے محبت رکھنے والوں کو ان سے خوف اور نفرت کرنے کے بجائے ان کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئے تھے۔ دوسری طرف اردو بولنے والوں کو بھی ان کے ساتھ ہونے والی کسی ممکنہ سازش سے ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ میرے ایک رشتہ کے ماموں جن کا نام میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا اور

جواب اس دنیا میں نہیں رہے اپنے سسرال کی طرف سے الطاف حسین کے قریبی رشتہ دار تھے۔ میں نے ان کو اپنا ایک ذاتی خط الطاف حسین کو ذاتی طور پر دینے کو دیا۔ یہ خط دراصل میرا سندھ کے حالات پر سیاسی تجزیہ اور سندھ کی عوام (اردو اور سندھی بولنے والوں) کی بھلائی، میل جول اور ایک ساتھ رہنے کے لئے سیاسی مشوروں پر مبنی تھا۔ اس خط میں میں نے نہ صرف کراچی بلکہ پورے سندھ کے حالات ومحرکات کو سامنے رکھ کر کچھ باتیں تجویز کی تھیں اور ساتھ ہی قوم پرست سندھی لیڈران کی چالوں جو کہ اردو اور سندھی بولنے والوں کو ایک ساتھ دیکھنا نہیں چاہتے تھے سے نمٹنے کے لئے صلح کے مشورے بھی دیئے تھے۔ ماموں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے یہ خط الطاف حسین تک پہنچا دیا تھا مگر مجھے اس کا کبھی جواب موصول نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی الطاف حسین سے ذاتی ملاقات ہوئی۔

سندھ میں الطاف حسین کی سیاست نے تیزی سے سندھ کے شہری علاقوں میں ایک نئی سیاسی تبدیلی پیدا کردی تھی۔ الطاف حسین کی تقریروں اور شکایتوں کی طرف سندھ کا اردو بولنے والا طبقہ مقناطیس کی طرح کھنچا چلا آیا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ سندھ میں تعلیم، نوکریوں اور دوسرے شعبوں میں کوٹہ سسٹم کے نفاذ سے کی جانے والی ناانصافیاں تھیں۔ سندھ کے تعلیمی اداروں میں اردو بولنے والے نوجوانوں کے خلاف متعصب عمل اور زیادتیاں ہورہی تھیں۔ کراچی میں دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے مزدور طبقے، ٹرانسپورٹرز وغیرہ کا کراچی کے لوگوں کے ساتھ نازیبا رویہ اور آئے

دِن کی جانے والی زیادتیاں تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں یونیورسٹی میں تھا میں اور میرے ساتھی اکثر یہ باتیں کرتے تھے کہ اگر حکومت نے اردو بولنے والے طبقہ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا علاج نہ کیا تو ایک وقت آئے گا جب مجبوراً یہ قوم جو اپنے ہاتھوں میں صرف قلم پکڑنا جانتی ہے بندوقیں اٹھائے ہوگی۔ اور اب الطاف حسین اور اس کی مہاجر قومی موومنٹ نے اس کو حقیقت کا رنگ دیدیا تھا۔ مہاجر قومی موومنٹ دراصل سندھ میں اردو بولنے والے طبقے جن کے ماں باپ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرکے آئے تھے کا ان کے خلاف ہونے والی سلسلہ وار ناانصافیوں کا اجتماعی ردِعمل تھا۔ مسئلہ ایک قومیت کے ماننے یا نہ ماننے کا نہیں تھا بلکہ ایک مخصوص طبقے کو پاکستان کی اقلیتی قوم کی طرح برتاؤ کرنا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1971 میں اپنے اقتدار میں آنے کے بعد جہاں اور بہت سے کارنامے انجام دیئے وہیں سندھ میں کوٹہ سسٹم نافذ کرکے سندھ شہری اور سندھ دیہی کی تفریق پیدا کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے اعلانیہ کے مطابق کوٹہ سسٹم کا مقصد سندھ کے دیہی علاقے کے لوگوں کو جن میں اکثریت سندھی بولنے والے مقامی لوگوں کی تھی کو سرکاری نوکریوں اور تعلیمی اداروں میں زیادہ مواقع فراہم کرنا تھے۔ مگر دراصل یہ صرف ایک سیاسی کارڈ کے طور پر لسانیت کے نام پر سندھ کے وڈیروں کے ہاتھ سے سندھ کے دیہی علاقوں کے سندھی بولنے والوں کو یہ ظاہر کرنا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی سندھی بولنے والوں کی جماعت ہے اور سندھ کے پیپلز پارٹی کے قائدین ہی ان کے اصل ہمدرد ہیں۔ لہٰذا

کوٹہ سسٹم دراصل تقسیم کرو اور سیاست کرو کے اصول پر پیپلز پارٹی کی حکمت عملی تھی۔ کوٹہ کے نفاذ سے سندھ میں سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان نفرتیں پیدا ہوئیں اور یوں سندھی اور مہاجر کی تفریق کو تقویت ملی۔ سندھ کو سیاسی اور طبقاتی طور پر دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ دس سالوں سے جاری سرکاری نوکریوں اور تعلیمی اداروں میں داخلوں میں کوٹہ سسٹم کے نام پر ہونے والی ناانصافیوں کا ردِعمل اب مہاجر قومی موومنٹ کی صورت میں دنیا کے سامنے تھا۔ الطاف حسین نے صرف ان ناانصافیوں کی جھلک اسٹیج پر کھڑے ہو کر دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کی اور اِن ناانصافیوں کی زد میں آنے والوں نے اس کو لبیک کہا۔

حیران کی بات یہ تھی کہ ضیاالحق کے فوجی دورِ حکومت میں جبکہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی مہاجر قومی موومنٹ کے جلسے بڑی کامیابی سے ہو رہے تھے جن میں لوگوں کا جمِ غفیر ہوتا تھا۔ بچے بوڑھے عورتیں الطاف حسین پر اتنا تن من دھن وارنے کو تیار تھے۔ نوجوانوں میں اسلحہ کی ریل پیل نظر آ رہی تھی۔ الطاف حسین کی مہاجر قومی موومنٹ اب کراچی سے نکل کر حیدرآباد، سکھر غرض کہ اندرونِ سندھ بھی پھیلتی جا رہی تھی۔

1986 سے 1988 کے دوران کراچی، حیدرآباد اور اندرونِ سندھ جہاں مہاجر قومی موومنٹ کی مقبولیت تیزی سے بڑھ رہی تھی وہیں مہاجر قومی موومنٹ کے نوجوان کارکنوں کا کراچی میں پٹھانوں اور پنجابی کمیونٹیز کے ساتھ یکے بعد دیگرے

خونی ٹکراؤ ہوا۔ دوسری جانب حیدرآباد سمیت سندھ کے اندرونی شہروں میں مہاجر سندھی خونی فسادات ہوئے۔ لہٰذا پلان یہ تھا کہ اردو بولنے والوں کا مہاجر کی شناخت دیکر سندھ میں باقی طبقوں سے ٹکراؤ کرایا جائے اور پھر ان کا مزید استحصال کیا جائے تاکہ وہ پاکستان اور پاکستان کے سسٹم سے منحرف ہوں۔ میں اس دور میں ہوئے یکے بعد دیگرے فسادات کی تمام تفصیل میں نہیں جانا چاہتا مگر ان فسادات میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ اسی طرح سے حیدرآباد میں 1987 میں جئے سندھ کے اسلحہ بردار کارکنوں نے شہر میں اندھا دھند فائرنگ کر کے بہت سے لوگوں کو مار ڈالا۔ جواب میں مہاجر قومی موومنٹ کے نوجوانوں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور یوں شہر ایک مرتبہ پھر سندھی مہاجر فسادات کا نشانہ بنا۔ 1986 کے دوران ہی کراچی کے علاقے سہراب گوٹھ قصبہ کالونی، علیگڑھ کالونی، اورنگی، ملیر۔ لانڈھی کورنگی مہاجر اور پٹھان، مہاجر پنجابی نسلی فسادات کا نشانہ بنے جس میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ کراچی کی معیشت کو اربوں روپوں کا نقصان ہوا۔ کراچی جو ملک کا سب سے بڑا معاشی حب تھا معاشی طور پر بہت پیچھے دھکیل دیا گیا۔ کراچی جس کو منی لندن اور روشنیوں کا شہر سے تعبیر کیا جاتا تھا اب جنگ کا میدان نظر آتا تھا۔ لوگوں کا امن و سکون مٹ چکا تھا۔ حیدرآباد اور سندھ کے دوسرے شہری علاقوں میں بھی اردو بولنے والوں کو جان بچانا مشکل تھی۔ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر سندھ کے دیہی علاقوں سے شہروں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ میرے کئی دوستوں کے کاروبار

لاڑکانہ میں تھے جن کو خالی ہاتھ لاڑکانہ سے کوچ کرنا پڑا اور ان کو جان بچانے کی خاطر سب کچھ کر کے حیدرآباد میں آ کر اپنے عزیز و اقارب کے یہاں پناہ لینی پڑی۔

1988 میں ضیاء الحق کی جہاز کے حادثہ میں ہلاکت ہوئی۔ جنرل اسلم بیگ نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی اور وعدے کے مطابق ملک میں عوامی الیکشن کرائے۔ کراچی سمیت سندھ کے شہری علاقوں سے مہاجر قومی موومنٹ نے بھاری اکثریت سے اپنے علاقوں میں کامیابی حاصل کی۔ 1988 کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مجموعی طور پر ملک میں کامیابی حاصل کی اور یوں جنرل اسلم بیگ نے اقتدار بے نظیر بھٹو کی پیپلز پارٹی کے حوالے کر دیا۔ بے نظیر اور اس کی پیپلز پارٹی نے ملک کا اقتدار سنبھالنے کے بعد بجائے اس کے کہ جمہوری قدروں کا پرچار کیا جاتا، سندھ کے شہری علاقوں کی عوام کی آواز کو سنا جاتا اور بے نظیر اور الطاف حسین سندھ کے عوام کے مسائل کو حل کرنے کی بات کرتے۔ اندر کچھ اور کھچڑی پک رہی تھی اور باہر دونوں اپنے اپنے پیروکاروں کو کچھ اور ہی بتا رہے تھے۔ 1988 میں الطاف حسین اور بے نظیر نے ایک ساتھ چلنے اور ایک 58 نکاتی ایجنڈے پر دستخط کئے اور پھر اس معاہدے پر عمل درآمد سے انکار کیا گیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اِن نکات میں کوٹہ سسٹم کے خاتمہ کی کوئی بات نہیں تھی۔

اندر کیا کچھ ہو رہا تھا کسی کو معلوم نہ تھے مگر کراچی سمیت سندھ کے شہری علاقوں کے اردو بولنے والے مہاجر کے نام پر الطاف حسین پر اندھا اعتماد کر رہے تھے۔ لہٰذا الطاف حسین مہاجر کے نام پر الطاف حسین اردو بولنے والے سندھ کے شہری طبقہ کا مکمل اعتماد حاصل کر چکا تھا اور اب وہ اس کو کسی طور پر اور کسی مقصد کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔

الطاف حسین اور بے نظیر بھٹو ایک ساتھ نہیں چل سکے اور نہ ہی سندھ کے عوام اور ان کے امن و سکون کو سامنے رکھا گیا۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کی سیاسی راہیں جدا ہوئیں۔ بے نظیر کے اقتدار میں آتے ہی کراچی میں مہاجر قومی موومنٹ کے کارکنوں کے خلاف آپریشن شروع ہوا۔ کراچی اور حیدرآباد میں ایم کیو ایم کے کارکنوں کی بڑی تعداد میں گرفتاریاں اور پولیس اینکاؤنٹرز میں ایم کیو ایم کے کارکنوں کی ہلاکتیں شروع ہو گئیں۔ بے نظیر کے پہلے دورِ حکومت میں 1988 سے 1990 کے دوران ریاستی طاقت اور مختلف سیاسی حربوں کے ذریعے ایم کیو ایم کی آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی جس کا کراچی اور سندھ کے شہری علاقو میں بہت برا اثر ہوا۔ کراچی، حیدرآباد اور سندھ کے شہری علاقوں سے لوگ اپنی جان و عزت بچانے کی خاطر پاکستان کے دوسرے علاقوں میں یا پھر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

1989 میں میری کمپیوٹر کی دُکان، حسن کمپیوٹر سروسز، جو کہ کراچی کے علاقے

گلشنِ اقبال میں اردو کالج کے سامنے یونیورسٹی روڈ پر واقع تھی کے سامنے ایم کیو ایم اور جمعیت الطلباء کے کارکنوں میں فائرنگ کے تبادلے ہوئے۔ حسن کمپیوٹر سروسز میرا چھوٹا بھائی چلاتا تھا۔ ہنگامے کے وقت میرا بھائی اور ماموں زاد بھائی دکان پر موجود تھے۔ ان دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ میرا بھائی خوش قسمتی سے بچنے میں کامیاب ہوگیا مگر ایک گولی میرے ماموں زاد بھائی کو لگی جس کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا اور خوش قسمتی سے اس کو ایک اور زندگی ملی۔ میری کمپیوٹر کی دکان کو لوٹنے والوں نے دکان کا بالکل صفایا کر دیا۔ میں اس وقت اپنے کام پر کراچی پورٹ ٹرسٹ میں تھا۔ دکان کی حالت دیکھ کر، اپنے کزن کو ہسپتال میں زندگی سے لڑتے دیکھ کر اور اپنے بھائی کے چہرے پر خوف دیکھ کر میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس وقت مجھے آسٹریلیا کی طرف سے فیملی مائیگریشن مل چکی تھی۔ میرا، میری اہلیہ ثریا، بچے صبیح اور ثروت کے پاسپورٹس پر آسٹریلیا میں مستقل سکونت کے ویزے ایک ماہ پہلے ہی لگے تھے اور میں اس شش و پنج میں تھا کہ پاکستان چھوڑ کر جانا چاہئے یا نہیں۔ مگر اس واقع نے مجھے ایک دم فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور میں ستمبر 1989 کو اپنی سرزمین کو خیر باد کہہ کر اپنے ماں، باپ، بہن اور بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو چھوڑ کر سڈنی چلا آیا۔ میں تو پاکستان چھوڑ کر آسٹریلیا آ گیا مگر میرا دِل پاکستان میں ہی لگا رہا۔

بے نظیر کے بعد نواز شریف کا دور آیا۔ نواز شریف نے بھی الطاف حسین کے

ساتھ شروع میں تو ہمدردی بھرے جذبات دکھائے اور ایم کیو ایم کے ساتھ ہوئے مظالم کا تدارک کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر نواز شریف کے دور میں 1992 میں ایم کیو ایم کے خلاف کراچی اور حیدر آباد میں فوج کی مدد سے خونی آپریشن کیا گیا۔ ہزاروں نوجوان یا تو لاپتہ ہوگئے یا پھر فوجی آپریشن میں بے دردی سے مارے گئے۔ کئی ایم کیو ایم کے صفِ اول کے لیڈر پاکستان چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو نکل گئے۔ الطاف حسین کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیز نے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ مگر اندر کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا اور سندھ میں کس قسم کی سازش کھیلی جا رہی تھی اس کا اندازہ میں اس ایک واقعہ کے ذریعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جب الطاف حسین کو ایجنسیز نے گرفتار کر کے کراچی جیل منتقل کیا تو اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کے چچا زاد بھائی اور اس وقت کی سندھی، بلوچی پٹھان فرنٹ کے بانی ممتاز علی بھٹو بھی کراچی جیل میں نظر بند تھے اور لاڑکانے کا میرا ایک سندھی دوست جو ممتاز علی بھٹو کی پارٹی کا کارکن تھا اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ ممتاز علی بھٹو سے ملنے کراچی جیل گئے ہوئے تھے۔ یہ دونوں آدھی رات کو میرے پاس گھر آئے اور بیان کیا کہ انہوں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ انہوں نے بتایا کہ الطاف حسین کو کراچی جیل میں لانے کے بعد ممتاز علی بھٹو کے پاس لایا گیا۔ لگتا تھا الطاف حسین پر بے حد ٹارچر کیا گیا تھا۔ الطاف حسین نے ممتاز علی بھٹو کو دیکھتے ہی کہا دیکھو سائیں ان لوگوں

نے کتنا میرے پر ٹارچر کیا جس پر ممتاز علی بھٹو نے الطاف حسین کو کہا بس ابھی پروسیس مکمل ہوا اب تم کو یہاں جیل میں کوئی نہیں چھیڑے گا اور یہاں آرام کرو۔ اور اس کے بعد الطاف حسین کو گردے کی بیماری کی وجہ بتا کر لندن کے جہاز میں بٹھا دیا گیا۔

1988 سے الطاف حسین لندن میں بیٹھ کر اپنی پارٹی چلا رہے ہیں۔ الطاف حسین کیا اردو بولنے والوں کے حقوق کے لئے کام کر رہے تھے آج یہ سب پر عیاں ہو چکا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ بات دس سال حکومت کرنے والے پرویز مشرف کو کیوں پتہ نہیں چلی جنہوں نے ایم کیو ایم کو اپنی حکومت میں شراکت دار بنا کر رکھا۔ آج الطاف حسین پاکستان اور پاکستان کی فوج کو کھلے عام گالیاں دیتا ہے مگر پاکستان کی حکومت اور فوج الطاف حسین کو واپس لانے اور غداری کا مقدمہ چلانے سے قاصر ہے؟

☆☆☆

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

(حفیظؔ جونپوری)

دیارِ غیر اور رگوں میں پاکستانیت

پاکستان میں زندگی سے سمجھوتہ کرتا گیا اور ساتھ ساتھ وقت اور حالات بھی بدلتے گئے، پھر ایک موڑ ایسا آیا کہ وطن کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں جانے کو ہمیشہ اچھا عمل نہیں سمجھنے کے باوجود بھی پاکستان کو چھوڑنے کا فیصلہ اس سمجھ سے کیا کہ اللہ نے میرا باہر جانے کا بندوبست شاید اس لئے کیا ہے تاکہ میں اپنے اور اپنی ذات سے جڑی ہر شے کے بارے میں سوچ سکوں، کچھ کر سکوں اور آزاد ماحول میں سانس لے سکوں۔

آسٹریلوی سرکار نے مجھے میری تعلیمی قابلیت اور پروفیشنل تجربے کی بدولت آسٹریلیا کی مستقل سکونت پیش کی اور میں نے 1989 میں پاکستان سے آسٹریلیا ہجرت کی۔ آسٹریلیا کی سرزمین پر جب میں نے اپنی اہلیہ ثریا حسن، سات سالہ بیٹے صبیح الحسن اور چار سالہ ثروت حسن، کے ساتھ قدم رکھا تو میرے پاس صرف میری تعلیم، اپنے شعبہ میں تھوڑا بہت تجربہ اور پانچ سو ڈالر تھے۔ آسٹریلیا نے مجھے میری دوسری پہچان دی۔ آسٹریلیا میں میرے ایک اور بیٹے، صفان الحسن نے نومبر 1993 میں جنم لیا۔ آسٹریلیا میں رہتے ہوئے مجھے ایک سے زیادہ شعبوں میں کام کرنے کا

آزاد ماحول میں موقع ملا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، تعلیم اور صحافت کے شعبوں کے علاوہ اسلامی اور پاکستانی کمیونٹی کے لئے کام کرنے کے مواقع ملے۔ آج میں یہ فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے پاکستان سے باہر رہ کر جتنا کام پاکستان اور پاکستانیوں کے لئے کیا وہ میں پاکستان میں نہیں کر سکتا تھا اور جس میں سب سے بڑا ہاتھ اِس آسٹریلیا کی سرزمین کا ہے۔

آج میں اللہ کے کرم، ماں باپ کی دعاؤں اور عزیز و اقارب اور دوستوں کی محبت اور حوصلہ افزائی سے بحیثیت ماہر تعلیم، ماہر انفارمیشن ٹیکنالوجی، کالم نگار، مصنف، صحافی، ایڈیٹر اِن چیف ٹریبیون انٹرنیشنل، انٹرنیشنل اسپیکر، کمیونٹی لیڈر اور اسلامی و کثیر الثقافت بڑی تقریبات کے منتظمین کی حیثیت سے نہ صرف آسٹریلیا بلکہ دنیا بھر میں ایک پہچانا جاتا ہوں۔

آسٹریلیا میں رہ کر میں نے جانا انسانی حقوق کی آزادی کسے کہتے ہیں۔ جمہوریت کس سسٹم کا نام ہے۔ ملک کا وقار اور قومی یکجہتی کیا ہوتی ہے۔ تعلیم کی کیا اہمیت ہے۔ قابلیت کی قدر کس کو کہتے ہیں۔ صحافت معاشرے کی نمائندگی کس طرح کرتی ہے۔ صحافی کی کیا معاشرتی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔ آزاد صحافت اور آزادیِ صحافت کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ انصاف، مساوات، قانون کی بالادستی غرض کہ ایک مہذب معاشرے کی کیا قدریں ہوتی ہیں۔ ایک کثیر الثقافت معاشرہ میں کس طرح سے عزت کے ساتھ رہا جاتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا خواب پاکستان کے بانیوں

نے دیکھا تھا مگر وڈیروں، جاگیرداروں اور سرداروں کے اشتراک سے بننے والے ملک میں یہ ممکن نہ ہوسکا اور اب اس کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔

آسٹریلیا میں رہتے ہوئے مجھے امریکہ، یورپ اور دنیا کے دوسرے خطوں میں جانے اور کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ مگر میرا ذہن اور روح ہمیشہ پاکستان کے لئے سوچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے رفتہ رفتہ صحافت اور لکھنے کے فن سے نوازنا شروع کیا۔ میں اس کو اللہ کی بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں کہ اس نے مجھے پاکستان کے سیاسی سماجی اور معاشی مسائل پر لکھنے کا موقع دیا۔ آج جب میں پاکستان اور اس میں ہونے والے بد سے بدترین حالات کو دیکھتا ہوں تو پاکستان کا مستقبل میرے لئے ایک سوال بن جاتا ہے۔ پھر دماغ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ وہ پاکستان نہیں جس کا خواب شاعرِ مشرق علامہ اقبال، بانی پاکستان محمد علی جناح نے دیکھا تھا اور یہ وہ پاکستان نہیں جس کے لئے ہندوستان کے 20 لاکھ مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دیا تھا۔ یہ وہ پاکستان نہیں جس کو دنیا کی عظیم ریاست بنانے کے خواب پاکستان کے بانی محمد علی جناح اور ان کے ساتھیوں نے دیکھے تھے۔ یہ وہ پاکستان نہیں جس کے لئے میرے جیسے پاکستان میں پیدا ہونے والے لاکھوں لوگوں کے آباو اجداد 1947 میں ہندوستان سے اپنی صدیوں پرانی شناخت چھوڑ کر آئے تھے۔ پہلے 25 سالوں میں پاکستان کا جغرافیہ تو بدلا ہی تھا۔ آج مفاد پرست اور نظریہ پاکستان کے دشمن ٹولے نے رہے سہے پاکستان کی سالمیت کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ یہ

وہ پاکستان نہیں جس کے بارے میں آج میں فخر سے اپنے بچوں کو بتا سکوں کہ دیکھو یہ میرا دیس ہے جس پر مجھے ناز ہے۔ آج سب سے بڑا سوال یہ نہیں کہ پاکستان پر چور اور ڈاکو حکومت کر رہے ہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ یہ چور اور ڈاکو کس طرح سے یہاں تک پہنچے؟

پاکستان سے باہر نکلنے کے بعد پاکستان اور پاکستان سے جڑے مسائل کو ایک نئے رنگ سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آسٹریلیا میں 1989 سے رہائش پذیر ہوں۔ 1993 سے 1997 کے عرصہ میں بحیثیت کمپیوٹر پروفیشنل مشرقِ وسطہ، انگلینڈ اور امریکہ جانے اور رہنے کا موقع ملا۔

مجھے سعودی پورٹ و کسٹم ڈیپارٹمنٹ کے لئے بحیثیت کمپیوٹر انالسٹ کام کرنے کا موقع ملا۔ سعودی عرب میں دیکھا کہ 1994 گو کہ سعودی عرب مسلم دنیا کا مذہبی مرکز ہے مگر وہاں پاکستانیوں سے زیادہ بھارتیوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بلکہ پورے مشرقِ وسطہ کا حال کچھ اس طرح کا ہے۔ سعودی عرب اور مشرقِ وسطہ میں پاکستان کے صوبے پنجاب اور سرحد کے چھوٹے چھوٹے علاقوں سے آئے ہوئے لوگ زیادہ تر لوگ مزدوری کے کاموں سے منسلک ہیں۔ گو کہ یہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہیں مگر ان لوگوں کی مقامی سعودیوں کی نظروں میں نہ تو کوئی عزت ہے اور نہ کوئی اہمیت۔ جس کی بڑی وجہ ان ممالک میں موجود پاکستانی سفارتخانوں کی بے حسی اور مایوس کن کارکردگی ہے، سفارش اور سیاسی بنیادوں پر تعینات سفارتی عملہ بس اپنی عیاشیوں

میں مست رہتا ہے۔

سعودی عریبیہ میں قیام کے دوران میں نے سرحد سے آئے غریب پٹھانوں کی جمعہ کی نماز کے بعد ریاض میں گردنیں کٹتے دیکھیں جو چھوٹی موٹی نوکریوں کی غرض سے صوبہ سرحد سے آتے ہیں مگر ان کے حوالے منشیات کی اسمگلنگ کرنے والے گروہ منشیات کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان کی خارجہ پالیسی ایسی نہیں رہی کہ ہم باقی دنیا نہیں کم سے کم مسلم دنیا میں تو پاکستان اور پاکستانیوں کی اہمیت منوا لیتے۔ سعودی عرب سمیت پورے عرب ممالک میں وہاں کی حکومتوں اور مقامی لوگوں میں پاکستانیوں سے زیادہ بھارتیوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ نوکریوں اور روزمرہ کے دوسرے شعبوں میں پاکستانیوں سے زیادہ بھارتیوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ پاکستانیوں کو ایک حقیر قوم سمجھا جاتا ہے۔ میرے حساب سے اس میں قصور پاکستان کو چلانے والے نااہل ٹولے کا ہے جنہوں نے نہ تو پاکستان کو اندرونی طور پر مضبوط کیا اور نہ ہی بیرونی طور پر۔ ملکوں کی دوستیاں باہمی مفادات سے ہوتی ہیں۔ اسلامی دنیا بالخصوص عرب ممالک کا پاکستان سے مذہبی رشتہ ہی نہیں بلکہ جغرافیائی اور عالمی سیاسی مفادات بھی وابستہ ہیں۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان کو چلانے والے نااہل سربراہان پاکستان کی یہ اہمیت اسلامی دنیا سے منوانے اور ان کی نظروں میں پاکستان اور پاکستانیوں کی عزت منوانے میں ناکام رہے بلکہ عرب ممالک کے تعلقات کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا۔ آج حال یہ ہے کہ یہاں بسنے والے پاکستانی اپنی شناخت میں

قید ہیں اور اپنے آپ کو پاکستانی بتانے میں گھبراتے ہیں۔

1995 سے 1997 تک میں نے امریکہ کے شہر شکاگو، نیویارک، واشنگٹن، ورجینیا، کیلیفورنیا میں کافی وقت گزارا اور جارج ٹاؤن یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی، سوفٹویئر اے جی روز لینڈ ورجینیا، رگلی کمپنی شکاگو، رائرسن اسٹیل شکاگو جیسے بڑے اداروں میں بحیثیت کمپیوٹر پروفیشنل کام کیا۔ مگر میرے لئے سب سے زیادہ خوش قسمتی کی بات میری ملاقات پاکستان کے مشہور صحافی سید تسبیح الحسن (مرحوم) سے ملاقات تھی۔ دراصل میں نے شکاگو میں پاکستان ٹوڈے کے نام سے انگلش اخبار دیکھا اور جان کر خوشی ہوئی کہ یہ اخبار کیلیفورنیا سے تسبیح صاحب شائع کر رہے ہیں۔ کراچی میں نسلی فسادات بدستور جاری تھے جس کی لپیٹ میں حیدرآباد سمیت پورا سندھ آچکا تھا۔ کراچی اور حیدرآباد میں نوجوانوں کے ہاتھوں میں کتابوں کے بجائے کلاشنکوف تھی۔ گھیراؤ جلاؤ اور مار دھاڑ کا بازار گرم تھا۔ پولیس مقابلے اور اینکاؤنٹر میں نوجوانوں کی موت کی خبریں اخبارات کا معمول تھیں۔ میں نے سندھ میں جاری نسلی فسادات اور قتل عام پر ایک مضمون پاکستان کے لئے تسبیح صاحب کو بھیجا۔ جواب میں تسبیح صاحب نے مجھے فون کیا۔ یہ میرے لئے بہت خوش قسمتی کی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے میں نے تسبیح الحسن صاحب کی صحافت پی ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے دیکھی تھی اور میں ان کا مداح تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھا جب تسبیح صاحب نے نہ صرف میرے مضمون کو پسند کیا بلکہ مجھے پاکستان ٹوڈے کی ٹیم شامل کرنے کی

دعوت بھی دی اور پھر میں پاکستان ٹوڈے کے لئے بحیثیت بیورو چیف شکاگو ذمہ داری سنبھالی۔

1997 میں نے آسٹریلیا واپسی کا فیصلہ کیا۔ سڈنی واپس آ کر پاکستان کی گولڈن جوبلی پر یعنی 14 اگست 1997 کو سڈنی میں پاکستان کا پہلا انگلش اخبار پاکستان ٹریبون کے نام سے شائع کیا۔ جس کو کچھ عرصہ بعد ٹریبون انٹرنیشنل کے نام کے ساتھ تبدیل کیا گیا اور ایک کثیر الثقافت اسلامی اور دوسری کمیونٹیز کے لئے پہلا انگلش ایتھنک اخبار کے طور پر آسٹریلیا میں متعارف کرایا جو آج اون لائن ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ اس اخبار کو 2015 میں میڈیا ایوارڈ میں دوسری پوزیشن ملی۔

1998 میں چاندرات کے نام سے عید الفطر کے موقع پر ایک چھوٹے میلے کا انعقاد کیا جس کا مقصد دیارِ غیر اور ایک غیر اسلامی ملک میں رہ کر اپنی مذہبی اور ثقافتی روایات کو برقرار رکھنا تھا۔ آج چاندرات عید فیسٹیول نہ صرف آسٹریلیا بلکہ دنیا کا سب سے بڑا چاندرات کے حوالے سے ایک کثیر الثقافت میلہ ہے جو بیک وقت آسٹریلیا کے تین شہروں سڈنی، میلبورن اور پرتھ میں چاندرات پر منعقد کیا جاتا ہے جس میں چالیس ہزار سے زیادہ لوگ شرکت کرتے ہیں۔

1998 میں اردو سننے والوں کے لئے ایک پاکستانی ہفتہ وار کمیونٹی ریڈیو متعارف کرایا اور جو کئی سالوں تک چلایا اور جو اپنی نوعیت کا منفرد خبروں، تجزیوں اور تفریح پر مبنی ریڈیو شو تھا۔

2001 میں امریکہ کے شہر نیویارک کی دو مشہور بلڈنگ (ٹوئن ٹاورز) کو دہشتگردی کے ذریعہ اڑا دیا گیا۔ جس میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ دنیا میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ مسلمانوں کے خلاف دنیا بھر میں نفرت انگیز آواز اُٹھی۔ مسلمانوں اور مسلمان ممالک کو مغرب میں دہشتگرد گردانا جانے لگا۔ بالخصوص پاکستان کو سب سے زیادہ ٹارگٹ بنایا گیا حالانکہ دہشتگردی کے اِس واقعہ میں کوئی پاکستانی ملوث نہ تھا۔ افغانستان پر امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر حملہ کر دیا اور پاکستان کے لئے کوئی اختیار نہ چھوڑا سوائے اس کے کہ پاکستان دہشتگردی کے خلاف جنگ کے نام پر اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا ساتھ دے مگر پھر بھی پاکستان اور پاکستانیوں کو دہشتگردی کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ جس میں مغربی میڈیا کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ آسٹریلیا میں بھی کچھ حالات ایسے ہی تھے۔ پاکستان اور پاکستانیوں کی دہشتگردوں سے جڑی خبریں میڈیا کی شہ سرخیوں کی زینب بن رہی تھیں۔ میں باقاعدگی سے ٹریبون انٹرنیشنل سڈنی سے شائع کر رہا تھا۔ ذہن پر ایک بہت بڑا بوجھ تھا کہ کس طرح سے مسلمانوں اور بالخصوص پاکستانیوں کی مثبت تصویر دکھائی جائے اور یہاں آسٹریلوی کو بتایا جائے کہ نہ مسلمان دہشتگرد ہیں اور نہ ہی پاکستان بلکہ مسلمانوں نے آسٹریلیا کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بہرحال میں نے ایک مضمون ''آسٹریلیا میں مسلمان'' (Muslims in Australia)) کے نام سے لکھنا شروع کیا اور اللہ سے دعا کی کہ میرے قلم سے کوئی ایسی چیز سامنے

آ جائے جس سے مسلمانوں کی ایک اچھی تصویر یہاں کی عوام کے سامنے آئے اور مسلمانوں کے خلاف جو کچھ بڑے میڈیا میں شائع ہو رہا ہے اس کو کاونٹر کی جائے۔ میں نے جب مضمون کے لئے ریسرچ شروع کی تو پتہ چلا کہ 1856 میں انگریز ہندوستان کے ان علاقوں کے اونٹوں کے چرواہے، کسان اور مزدور آسٹریلیا لے کر آئے تھے جواب پاکستان ہیں یعنی بلوچستان، سندھ اور پنجاب۔ بس پھر کیا تھا، اللہ نے ہاتھ پکڑ لیا تھا میں نے مزید ان لوگوں پر ریسرچ جو سندھ، پنجاب اور بلوچستان سے آسٹریلیا مزدوری کی غرض اور آسٹریلیا کی تعمیر و ترقی کے لئے لائے گئے تھے۔ میں لکھتا گیا اور مضمون بڑھتا گیا، پھر میں آسٹریلیا کے مختلف شہروں میں گیا اور ان پاکستانی لوگوں کے انٹرویوز کئے جن کے آبا و اجداد آج سے سو سال اور کئی دہائیوں پہلے آسٹریلیا آئے اور انہوں نے کس طرح آسٹریلیا کی تعمیر کی۔ یہ مضمون اب ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ میں نے پھر آسٹریلیا فار پاکستانیز کے نام سے کتاب شائع کی۔ اِس کتاب کی رونمائی نیو ساؤتھ ویلز کی پارلیمنٹ کے ایک ہال میں یکم دسمبر 2003ء میں اُس وقت کے شہریت کے وزیر جناب جان ہیز زٹرگوس کے ہاتھوں سے ہوئی، کتاب کو یہاں کے مقامی لوگوں اور اہم شخصیات نے بہت سراہا، یہ کتاب آج یہاں کی لائبریز کی زینت ہے۔

پھر باقاعدگی سے پاکستان کے قومی دنوں پر پاکستانی کمیونٹی کے لئے پروگرامز، کشمیریوں کی آزادی کی جدوجہد کی مہم کے لئے کشمیر فورمز اور ریلیز، دنیا کے مختلف

ممالک میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہے عزائم کے خلاف ریلیز متعارف کرائیں۔ 2015 میں آسٹریلیا میں پہلی مرتبہ حلال ایکسپو اور انٹرنیشنل حلال کانفرنس کا انعقاد کیا جو آج ایک انٹرنیشنل ایکسپو اور کانفرنس ہے اور باقاعدگی سے سڈنی میں منعقد کی جاتی ہے جس میں دنیا کے کئی ممالک سے حلال کمپنیاں اپنی حلال پروڈکس اور سروسز متعارف کراتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں یہاں بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ پاکستانیوں کو اگر موقع ملے تو وہ کام کر سکتے ہیں جو شاید ہی کسی اور طبقہ کے لوگ کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(حسرتؔ موہانی)

آج میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں!

پاکستان کے حکمران اور عوام پاکستان کی بدحالی اور بڑھتے ہوئے جرائم کا ذمہ دار عالمی طاقتوں، امریکہ، پڑوسی ممالک وغیرہ کو ٹھہراتے ہیں۔ شاید میری یہ باتیں پاکستان کے نوجوانوں کو انوکھی اور حیران کن لگیں مگر وہ لوگ جو 70 اور 80 کی دہائی میں طالبعلم تھے، مختلف شعبوں میں کام کر رہے تھے یا پھر معاشرے کے کسی اہم منصب پر فائز اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے تھے ماضی کی ان حقیقتوں سے انکار نہیں کریں گے جن کا ذکر میں قلم بند کرنے جا رہا ہوں۔ دنیا کو موردِ الزام ٹھہرانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکیں اور دیکھیں کہ کیا یہ کہیں ہماری ہی کی ہوئی غلطیوں، خطاؤں، لاپروائیوں یا پھر بے حسی کا فسانہ تو نہیں جو آج ہم دنیا میں اپنی پاکستانی شناخت بتانے میں جھجکتے ہیں۔ بے شک وہ خالقِ مطلق جو سب کا مالک ہے انصاف کرنے والا ہے۔

یہ کوئی بہت پرانے زمانے کی داستان نہیں بلکہ آج سے چند دہائیوں تک کی حقیقتیں ہیں یعنی 1970 کی دہائی تک پاکستان میں تہذیب، تمدن، عزت، تعلیم، شہری حقوق اور قومی تشخص جیسے معاشرتی عناصر پاکستان کے مجموعی معاشرہ کا زیور ہوا

کرتے تھے۔

اگر تعلیم کی بات کریں تو آسٹریلیا کی طرح شہر کے ہر علاقے میں کونسل کی ایک لائبریری ہوتی تھی۔ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق کتابیں آراستہ ہوتی تھیں جن کو پڑھنے کے لئے کرائے پر گھر بھی لے جایا جاسکتا تھا یا پھر لائبریری میں موجودہ کمرہ مطالعہ میں بیٹھ کر استفادہ کیا جاتا تھا۔ اس لائبریری میں مشہور مقامی اور بین الاقوامی اخبارات اور رسالے بھی دستیاب ہوتے تھے جس کے لئے ایک الگ جگہ ہوتی تھی جہاں لوگ روزانہ فارغ اوقات میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے تھے اور پھر لائبریری سے منسلک کسی کیفے یا چائے کے کھوکھے پر بیٹھ کر تعمیری بحث ومباحثہ کرتے پائے جاتے تھے۔ شہر میں ایک پاکستان سینٹر ہوا کرتا تھا جس میں شہر کی بڑی لائبریری ہوتی تھی جس میں اسکول سے لیکر یونیورسٹی تک کے طلبا کے لئے ہر شعبہ سے متعلق کتابیں میسر ہوا کرتی تھیں۔ پاکستان سینٹر کا مقابلہ شہر میں موجود برٹش (برطانوی) سینٹر یا امریکن سینٹر سے کیا جاتا تھا۔ پاکستان سینٹر میں بالخصوص قومی دنوں کے موقعوں پر قومی تشخص اور قومی ومعاشرتی عنوانات پر بڑے تعمیری پروگرام منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان سرگرمیوں سے نوجوانوں کی فکری نشوونما ہوتی تھی اور ان میں قومی ذمہ داری جنم لیتی تھی۔

سرکاری پرائمری اور ہائی اسکولوں میں اردو، فارسی، عربی اور انگلش پڑھائی جاتی تھی اور بہت سے اسکولوں میں یہ لازمی مضامین ہوتے تھے۔ جس اسکول میں میں نے تعلیم حاصل کی وہاں ہمیں عربی اور فارسی میں سے کسی ایک مضمون کو لازمی پاس کرنا

ہوتا تھا اور جبکہ اردو اور انگلش نصاب کے لازمی مضامین تھے۔

اگر صحت وصفائی کی بات کریں تو شہر کے ہر علاقے میں باقاعدگی سے بلدیہ کی طرف سے مچھر اور خطرناک کیڑے مکوڑے مارنے کے لئے شہر میں باقاعدگی سے سپرے کیا جاتا تھا۔ پرائمری اسکولوں میں محکمہ صحت کی طرف سے معمول سے طبی معائنہ کے لئے ڈاکٹرز آیا کرتے تھے جو بچوں کا معائنہ کرتے تھے۔ سرکاری ہسپتالوں میں بہترین علاج ہوا کرتا تھا جو بالکل مفت تھا۔ ایمرجنسی کا بہترین نظام تھا، ہسپتالوں کی اپنی ایمبولینس سروسز ہوا کرتی تھی جو فوری طور پر ہر علاقے میں ہنگامی بنیادوں پر پہنچ جاتی تھیں۔

اگر کھیلوں کی بات کریں تو آسٹریلیا کی طرح ہر علاقے میں کھیلوں کے میدان ہوتے تھے۔ جمعہ یا اتوار کو باقاعدگی سے کھیلوں کی سرگرمیاں ہر میدان میں نظر آتی تھیں۔ علاقے کی نامور شخصیات مختلف کھیلوں کے کلب کی سرپرستی کرتی تھیں۔ شہر کے مختلف علاقوں میں خوبصورت پارک ہوا کرتے تھے جن میں لوگ اپنے اہل خانہ کے ساتھ شام کے اوقات میں اپنے ساتھ کھانا لے کر جایا کرتے تھے، پھر مختلف لوگ مل جل کر ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے، عورتیں اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کرتی تھیں، بچے کھیل کود میں مشغول پائے جاتے تھے اور مرد حضرات علاقے، ملک کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی معاملات پر بحث کیا کرتے تھے۔

شہر میں ادبی، فنی، تعمیری اور مختلف معاشرتی سرگرمیوں کی بات کریں تو بڑے بڑے عالمی مشاعرے، تقریری مقابلے، قرأت تلاوتِ قرآن اور نعتیہ مقابلے، اسٹیج

تھیٹر پاکستانی فلم فیسٹیول غرض کہ ہر طرح کی سرگرمیاں سال کے مختلف اوقات میں جاری وساری رہتی تھیں جن میں لوگ اپنی دلچسپی کے مطابق بڑھ چڑھ کر بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوا کرتے تھے۔

اگر پولیس کے نظام کی بات کریں تو علاقے یا شہر کی پولیس میں مقامی پولیس افسران ہوا کرتے تھے، شہر اور علاقے کے معززین سے پولیس افسران کا سلسلہ وار رابطہ معمول کی میٹنگ کے ذریعہ رہتا تھا۔ غرض کہ شہری اور محلہ کمیٹی کا علاقے کے تھانے سے رابطہ ہوا کرتا تھا۔ علاقے کے چھوٹے موٹے جرائم سے نمٹنے کے لئے محلہ کمیٹی کے افراد اور علاقے کے تھانے کے افسران بیٹھ کر ان پر قابو پانے کے راستے نکالا کرتے تھے۔ شہری اور محلہ کمیٹی کے افراد رضا کارانہ طور پر ان سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے اور شہر اور محلہ کے مسائل کو اپنے گھر کے مسائل سمجھتے تھے۔ میرے والد، سید شفیق الحسن مرحوم، حیدرآباد سندھ کی شہری کمیٹی کے سرگرم رکن رہے جو اپنے آپ کو فخر سے ایک سماجی کارکن کہتے تھے۔

اگر سرکاری محکموں میں کام کرنے والا عملہ وافسران کی بات کریں تو ہر محکمہ میں تقرریاں قابلیت کی بنیاد پر ہوا کرتی تھیں۔ نہ کوئی زبان کا مسئلہ تھا، نہ فرقہ کا اور نہ ہی علاقے کا جو اہل ہوتا تھا وہی منصب پاتا تھا۔

اگر شہر کی ٹرانسپورٹ کی بات کریں تو شہر میں لوگ زیادہ تر سرکاری ٹرانسپورٹ پر انحصار کرتے تھے۔ میرے شہر حیدرآباد سندھ میں ڈبل ڈیکر بس چلا کرتی تھی جو لندن، پیرس اور مشہور بین الاقوامی شہروں میں اب بھی چلا کرتی ہیں۔ کراچی میں

لندن اور میلبورن کی طرح ٹریم چلا کرتی تھی جو شہر کی اہم شاہراہوں سے گزرتی ہوئی شہر کے مرکز پر ختم ہوتی تھی۔

کیونکہ اس وقت ریڈیو ہی الیکٹرانک میڈیا تھا لہٰذا لوگ بڑے ذوق وشوق سے ریڈیو سنا کرتے تھے۔ ریڈیو پر فن موسیقی کے علاوہ تعمیری اور قومی تشخص کے پروگرام پیش کئے جاتے تھے۔ میں خود طلبا کے لئے ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے پروگرام بزمِ طلبا کا حصہ رہا۔

اگر نوجوانوں کے فارغ الاوقات مصروفیات کی بات کریں تو شہر میں فن موسیقی کے کلب ہوا کرتے تھے جہاں سے بڑے بڑے گلوکار اور فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹ پیدا ہوئے ہیں۔ شہر میں قومی اور مذہبی دنوں پر قومی یکجہتی، قومی تشخص اور معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالے سے تعمیری پروگرام شہر کی انجمنیں، مقامی حکومت اور مختلف فلاح و بہبود کے ادارے مل کر منعقد کیا کرتے تھے۔ لوگ ان پروگراموں میں شریک ہونے اور ان کو کامیاب بنانے کے لئے مہینوں پہلے سے تیاریاں کرتے تھے۔

شہر، صوبے اور ملک میں روزگار اور مراعات کے حوالے سے جامع پروگرام ہوا کرتے تھے۔ لوگ بے روزگار نظر نہیں آتے تھے۔ شہر کا نوجوان ہو یا بزرگ سب میانہ روی کے ساتھ خوش تھے۔ لوگ صبر اور استقامت کے سنہری اصول پر عمل پیرا تھے۔ چاہے لوگ تعلیم یافتہ ہوں یا ان پڑھ مذہب وانسانیت ان میں عملی طور پر نظر آتی تھی۔

آج پاکستان میں دنیا میں ایجاد ہوئی ہر ٹیکنالوجی موجود ہے۔ بے شمار انٹرنیشنل ٹی وی چینلز ہیں۔ ہر مرد، عورت اور بچے کے ہاتھ میں موبائل فون ہے۔ کمپیوٹرز کی ریل پیل ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں رنگین اخبارات ہیں۔ ہر سطح کے بے شمار تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ تھانے موجود ہیں، عدالتیں موجود ہیں، سرکاری محکمے اور بڑھ گئے ہیں، سرکاری وزارتی اور بڑھ گئی ہیں۔ سیاسی جماعتیں بڑھ گئی ہیں۔ سیاسی لیڈران سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر کیا وجہ ہے کہ شہروں اور قصبوں سے لائبریریاں ختم ہو گئیں، کھیلوں کے میدان برباد ہو گئے، پارک و باغات نشے کے عادی افراد سے آباد ہیں۔ انصاف کی بات تو بہت دور آج تھانے میں شریف آدمی جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آج مسجدیں تو نمازیوں سے بھری نظر آتی ہیں مگر اسلام کے سنہری اصول کہیں نظر نہیں آتے۔ کیا وجہ ہے کہ ٹی وی چینلز سے سینکڑوں ٹاک شوز میں ملک وقوم کے بہتر مستقبل کی باتیں کی جاتی ہیں، بے شمار مذہبی پروگرامز پیش کئے جا رہے ہیں مگر ریاست اور رعایا دونوں ہی بربادی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کو تو بہت آزاد کر دیا مگر عام آدمی کی آواز سننے والا کوئی نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ پولیس تو موجود ہے، تھانے موجود نہیں اور عدالتیں کھلی ہیں مگر امن وسکون، انسانی حفاظت اور انصاف کہیں نظر نہیں آتا۔ کیا وجہ ہے کہ آج کم سن بچیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتیاں ہو رہی ہیں، میڈیا دل ہلا دینے والی رپورٹنگ کے ذریعہ اپنی ریٹنگ بڑھا رہا ہے مگر حکمرانوں کے چہروں پر کوئی شرمندگی نہیں اور وہی جھوٹے اور فریبی دعوے جاری وساری ہیں! کیا وجہ ہے کہ

حکمران اور سیاسی مداریوں کو چند ہفتے پہلے عوام سے کئے گئے وعدے یاد نہیں مگر لوگ انہیں سیاسی مداریوں کی پوجا کرتے نظر آ رہے ہیں؟

کیا یہ سب کچھ بین الاقوامی طاقتوں اور پڑوسی ملکوں نے کیا ہے۔ آج کیوں ایک عام آدمی اور سب سے بڑے منصب پر بیٹھا ہوا حکمران دونوں کا ضمیر مر چکا ہے۔ کیا یہ سب امریکہ، برطانیہ یا یہودیوں کی سازشوں کا نتیجہ ہے؟ جب تک ہم سچ نہیں کہیں گے اور سچ سننے کا حوصلہ نہیں رکھیں گے سچ کو اپنی زندگیوں میں قائم بھی نہیں کر سکیں گے۔ آج میرے جیسے ادنیٰ لکھنے والے کے پاس وہ الفاظ نہیں جن کی مدد سے میں پاکستان میں جاری ان گھناؤنے جرائم کو قلمبند کر سکوں جو ہر روز ہو رہے ہیں۔

مہذب دنیا، ترقی یافتہ اور خوشحال ریاستوں میں تو ٹیکنالوجی کی ریل پیل کے ساتھ شہر کی لائبریریاں ختم نہیں ہوئیں، وہاں تو شہر کی پولیس خود جرائم کا شکار نہیں ہوئی، وہاں تو شہر کے میدان اور باغات ویران نہیں ہوئے۔ پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ یقیناً جدید دور کی جدید ٹیکنالوجی نے ریاستوں اور قوموں کی معاشرتی طور پر مضبوط، خوشحال اور امن وسکون کا گہوارہ بنایا ہے۔ پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان جو بنا ہی مسلمانوں کو ان کے بنیادی حقوق دینے کے لئے تھا آج دنیا میں سب سے زیادہ غیر محفوظ اور جرائم کی دوڑ میں سرفہرست ہے۔

آج پاکستان کے حکمران اور عوام سب دوسرو پر معاشرے کے تباہ ہونے کی ذمہ داریاں ڈالتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سب پاکستان کی تباہی میں شراکت دار

ہیں۔ آج کا پاکستان اُس پاکستان سے بالکل مختلف نظر آتا ہے جو 1940 کی قرارداد میں منظور کیا گیا تھا اور جس کا وجود 1947 میں آیا تھا۔ بلکہ میں یہ سطریں بڑے افسوس کے ساتھ قلم بند کر رہا ہوں کہ آج مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ باتیں سچ ثابت ہو رہی ہیں جو انہوں نے شورش کاشمیری کے جریدے چٹان کے دیے گئے انٹرویو میں 1946 میں کہی تھیں اور جس کو شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ابوالکلام آزاد میں بھی رقم کیا۔ ابوالکلام آزاد نے دو ہفتہ پر محیط اس تفصیلی انٹرویو میں پاکستانی کی جغرافیائی بناوٹ یعنی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں سندھ، پنجاب، بلوچستان اور شمالی پختون علاقوں کے پس منظر میں پاکستان کے بارے میں کہا تھا کہ محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کے بعد اور جب اسلام کے نعروں کا جوش تھم جائے گا مشرقی پاکستان پاکستان سے الگ ہو جائے گا کیونکہ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، سوچ، زبان اور کلچر مختلف ہے۔ مغربی پاکستان موجود صوبوں کے جاگیردار غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں اپنے مفادات کے لئے پاکستان کو استعمال کریں گے جیسے کہ عرب سرزمین پر ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے بانی محمد علی جناح کی وفات کے بعد لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا اور پھر ویسا کچھ ہوا جیسا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا۔ آج پاکستان ایک ایسی قیادت کو ترس رہا ہے جو پاکستان کی سوئی ہوئی قوم کو جگا سکے اور پاکستان کی تقسیم شدہ عوام کو ایک پاکستان کے پرچم تلے لا سکے۔ جو پاکستان ایک ایسا انقلاب لا سکے جو پاکستان سے جاگیردارانہ نظام اور سوچ کو مٹا سکے اور عوام کو جگا سکے۔ جو پاکستان میں ایسے نظام کی بنیاد ڈالے جو بلا کسی رنگ ونسل، زبان، فرقہ

اور علاقہ سے پاک ہو۔ جہاں ہر چھوٹے بڑے کے لئے ایک ہی قانون اور سزا ہو۔ جہاں ایسا نہ ہو کہ ایک وڈیرے کا بیٹا تو سرِ عام قتل کر کے دندناتا پھرے اور غریب کے ساتھ ظلم و زیادتیوں کا مقدمہ بھی درج نہ ہو۔ جہاں لوگوں کی عزت محفوظ ہو اور یکساں بنیادی حقوق ملیں۔

اگر ایسا نہیں ہوتا تو پاکستان میں جاری جرائم، لوٹ مار، قتل و غارت گری اور نفرتیں اور بڑھیں گی کیونکہ یہ پاکستان کے موجودہ حکمرانوں کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں جو اپنے خاندانوں کی حکمرانی قائم رکھنے کے لئے پاکستان میں نئے صوبوں کی مخالفت کریں گے۔

☆☆☆

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مِری جبینِ نیاز میں

(علامہ اقبالؒ)

کیا تعصّبات کی قید سے رہائی اور اصل شناخت کا تعین ہوگا

ہم نے ہندوستان میں انگریزوں کی سلطنت میں اپنے بنیادی حقوق کی خاطر انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے پاکستان بنایا اور پھر آزادی سے آج تک اُسی انگریز کے ملک میں پناہ کے لئے بھاگتے ہیں اور اپنے جان و مال کے تحفظ کے لئے انگلستان میں رہنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ ہم نے جس ہندو سامراج سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کی تقسیم کر کے اپنا علیحدہ وطن بنایا آج اسی ہندو سامراج سے دوستی رکھنے کو امن کی آشا کہتے ہیں۔ ہم نے ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیتی قوم (مسلمان) ہونے کے ناطے اپنے بنیادی حقوق کی آزادی کے لئے پاکستان بنایا مگر اسی پاکستان میں اقلیتی قوموں پر وہ ظلم ڈھاتے ہیں جو شاید پاکستان سے پہلے مسلمانوں پر بھی نہ ڈھائے جاتے ہوں۔ ہماری ایک بڑی مذہبی جماعت نے بانیِ پاکستان کو کافرِ اعظم کہا اور پاکستان کی نظریاتی مخالفت کی پھر قیام پاکستان کے بعد آج تک وہی جماعت بانیِ پاکستان کا نام لیکر

پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنانے کا نعرہ لگا رہی ہے اور ہم انہی کے جلسوں میں جا کر اسلام کو پاکستان کا قلعہ بنانے کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو وقت پر ہسپتال بھی نہ پہنچا سکے اور وہ ایک ناکارہ ایمبولینس میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ہم ان کی تصویر ہر اعلیٰ کرسی کے پیچھے زیبائش کے لئے ضرور لگاتے ہیں اور پھر ہر اُس کام کو کرنے سے نہیں گھبراتے جو بانیِ پاکستان کے اصولوں کی نفی کرتا ہے۔

ہمارے سامنے بانیِ پاکستان کے سب سے قریبی تحریکِ پاکستان کے ساتھی اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں ایک جلسہ عام میں گولیاں مار کر شہید کیا گیا مگر اُن کو کیوں شہید کیا گیا یہ ہم آج تک معلوم نہ کر سکے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والی ان کی سگی بہن کو ہم نے مادرِ ملت کا لقب دیا پھر ہم نے ان کو پاکستان کے سب سے پہلے فوجی آمر فیلڈ مارشل ایوب خان کے ہاتھوں شرمناک شکست سے ہمکنار کیا۔

پاکستان کے پہلے فوجی آمر ایوب خان نے قائداعظم کی مسلم لیگ کے دو ٹکڑے کئے اور کنونشن مسلم لیگ کو جنم دیا پھر ذوالفقار علی بھٹو کو کنونشن مسلم لیگ کو فعال بنانے کے لئے سیکرٹری جنرل کے عہدہ سے نوازا اور مختلف وزارتوں سے نوازا۔ ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو اینڈ کمپنی نے دس سال پاکستان پر حکومت کی۔ پھر ہم نے ایوب خان کو تو ''ایوب کتا'' کا نعرہ لگا کر ملک کی صدارت چھوڑنے پر مجبور کر دیا مگر ذوالفقار علی بھٹو اور اس کی نئی پاکستان پیپلز پارٹی کا پورے مغربی پاکستان میں

والہانہ استقبال کیا۔

پاکستان کی تاریخ کے سب سے بڑے جمہوری انتخابات جو مغربی اور مشرقی پاکستان میں 1970 میں ہوئے، جس میں مشرقی پاکستان کے مجیب الرحمن اور ان کی سیاسی جماعت عوامی لیگ کو سب سے زیادہ نشستیں ملیں اور ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کو نمبر 2 حیثیت ملی۔ مگر ہم نے مجیب الرحمن کو غدار کہا اور ذوالفقار علی بھٹو جو مشرقی پاکستان ٹوٹنے اور بنگلا دیش بننے کی وجوہات میں ایک کردار تھے اور جنہوں نے دنیا کی تاریخ میں خود کو پاکستان کا پہلا سویلین مارشل لا کے طور پر رقم کرایا، ہم نے اسے قائدعوام کہا۔ پھر ہم نے اسی قائدِ عوام کو ایک فوجی آمر جنرل ضیاالحق کے ہاتھوں پھانسی چڑھایا۔ پھر اسی فوجی آمر کی بنائی گئی نام نہاد سیاسی حکومت کو دس سال پروان چڑھایا اور ضیاالحق کو نیک مومن حکمران کہا۔ پھر اسی نیک مومن حکمران کی 15 سے زیادہ اعلیٰ فوجی افسران اور ایک امریکی سفیر کے ساتھ جہاز کے پُراسرار حادثہ میں ہلاکت ہوئی۔ مگر ہم نے اس حادثہ کی حقیقت آج تک جاننے کی کوشش نہ کی۔ پھر اسی فوجی آمر کی گود سے جنم لینے والے سیاستدان نواز شریف نے جب اپنی مسلم لیگ (ن) کا نعرہ لگایا تو ہم سب اس کے پیچھے چل پڑے، کسی نے اسے ''شیرِ پنجاب'' کہا تو کسی نے ''شیرِ پاکستان''۔ پھر اُسے وزیراعظم کی کرسی پر بٹھایا۔ ہمارا سفر اور آگے بڑھتا گیا۔

ہم نے ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو کو باپ کی موت کے نام پر ووٹ دیکر پاکستان کی پہلی خاتون وزیرِ اعظم بنایا۔ پھر جلد ہی بدعنوانی کے جُرم میں وزارت عظمیٰ

کی کرسی سے اُتار کر نظر بند کر دیا۔ خیر بے نظیر نے بھی اپنے بڑوں کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے سیاسی آقاؤں کے ملک کا رُخ کیا اور یورپ میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کیا۔ اور ہم نے ایک مرتبہ پھر شیر کو جگایا اور پاکستان کی تقدیر اس کے ہاتھ میں دے کر اسے پھر وزیراعظم بنا دیا۔ ہمارے کتے بلی کا کھیل ختم نہیں ہوا اور ایک مرتبہ پھر ایک نئے فوجی آمر جنرل پرویز مشرف نے تاریخ کو دہرایا اور مارشل لاء لگا دیا۔ ہمارے کچھ سیاستدانوں بالخصوص نواز شریف کے قریبی سیاسی بھائیوں نے اُس فوجی آمر کو خوش آمدید کہا اور دس سال ایک نئے جمہوری رنگ میں پاکستان کو نہلایا۔ پھر جب ہمارا دِل اُس فوجی جنرل سے بھر گیا اور ہمارے بیرونی آقاؤں کو بھی وہ فوجی راس نہ آیا تو ہمیں شیر دوبارہ یاد آ گیا جو سعودی عرب میں سکون کی نیند سو رہا تھا ہم نے اس کو آواز دی مگر وہ نا آیا مگر شیر کی خالہ نے آواز سن لی اور دبئی میں بیٹھ کر قائداعظم کی بیٹی اور جمہوریت کی علَم بردار نے فوجی آمر پرویز مشرف سے ڈیل کی اور ہم نے اسے پاکستان لبیک کہا۔ اُس شیر کی خالہ نے شیر کو آقاؤں کے ملک انگلستان میں بلا کر منا لیا اور ایک مرتبہ پھر ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا اعلان کیا۔ ہم نے اُسے دختر پاکستان کہا اور اس کا پورے پاکستان میں والہانہ استقبال کیا اور پھر اُس دختر پاکستان کو راولپنڈی کے ایک جلسہ میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا۔ ہم نے سارا منظر ٹی وی پر براہِ راست دیکھا مگر ہمیں آج تک اس کے قاتلوں کا پتہ نہیں چلا۔ مگر ہم نے پھر اس کی موت کا قرض چکایا اور اس کے شوہر جس کو ہم نے ماضی مین مسٹر ٹین پرسینٹ کے لقب سے نوازا تھا پاکستان کا صدر مملکت بنا دیا۔ لیکن ٹھہریئے میں بھول گیا اِس دوران

شیر بھی جاگ گیا تھا ہم نے اسے بھی خوش آمدید کہا۔ زرداری اور شریف کی مفاہمت کی سیاست شروع ہوئی، ہم نے ان کے ماضی کے کارنامے بھلا کر خوشیاں منائیں اور چین کی سانس لی کہ ہم نے فوجی آمریت سے تو جان چھڑائی۔ پھر زرداری صاحب نے زر کے کرشمے دکھائے۔ پانچ سال بہت عیش و آرام کئے اور سب کو عیش بھی کرائے کسی بڑی پارٹی کو حکومت سے باہر نہیں رہنے دیا۔ سب کو خوش کرنے کی سیاست چلی اور ہم نے برداشت کیا کہ چلو جمہوریت تو مضبوط ہو رہی ہے نا!

پھر پانچ سالوں میں بہت سی چیزیں ملک میں مضبوط ہوئیں مثلاً مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، چور بازاری، لوٹ مار، ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، فاشی، کھاؤ اور کھانے دو کی سیاست وغیرہ وغیرہ مگر ہم نے برداشت کیا کہ چلو کوئی بات نہیں جمہوریت تو پہلی دفعہ اپنے پانچ سال مکمل کرنے جا رہی ہے نا! پاکستان میں ایک نیا ریکارڈ تو قائم ہو رہا ہے نا!

پھر ہمارا دل زرداری صاحب کی حکومت سے بھی بھرنے لگا، ہم نے ان کے خلاف بہت باتیں کیں بڑے الزامات لگے اور ہم نے کہا کہ بس یہ اپنی کرسی چھوڑیں تو ان کی پکڑ ہوگی۔ آج زرداری صاحب شیر کے گھر یعنی اپنے پنجاب میں اپنے نئے محل کے مزے لے رہے ہیں مگر ہمیں ان میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ ہم نے تو جمہوریت میں آگے بڑھنا ہے اور اب ہمارا کام تو شیر کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے۔ آج ایک امریکی ڈالر سو روپے سے بھی زیادہ تجاوز کر گیا ہے، مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آج کراچی دنیا کا خطرناک ترین شہر بن گیا ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں ہم الطاف بھائی کو

ناراض تو نہیں کر سکتے نا!

آج کم سن اور نابالغ بچیوں کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں اور مجرم پکڑے بھی نہیں جاتے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آج وڈیرے کا بیٹا سرِ عام ایک نوجوان کو گولیاں مار کر مقتول کے لواحقین سے سودا بازی کر لیتا ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آج ایک گرجہ گھر پر دہشتگردی کر کے پاکستان کو ساری دنیا میں بدنام کیا جاتا ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں!

ہم نے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا اور اسے مسلمانوں کے اتحاد اور نمونہ کہا مگر ہم نے کسی مسجد کے باہر لکھا کہ یہاں صرف اہلِ حدیث نماز پڑھ سکتے ہیں اور کسی مسجد کو کہا کہ یہ صرف سنیوں کی مسجد ہے اور کسی کے لئے کہا کہ یہاں صرف شیعہ آ سکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم سب پاکستانی ہیں مگر پھر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ آپ سندھی ہیں یا مہاجر، پنجابی ہیں یا سرائیکی، پٹھان ہیں یا ہزارہ، بلوچی ہیں یا مکرانی، گجراتی ہیں یا کچھی وغیرہ وغیرہ۔

ہم اپنے وطن پاکستان سے دوسرے ملک میں ذریعہ معاش یا تعلیم یا کسی اور وجہ سے کوچ کرتے ہیں تو ہر چیز کو بھول سکتے ہیں مگر اپنی پسند کے سیاسی لیڈر اور سیاسی پارٹی کو نہیں لہٰذا دیارِ غیر میں بھی اپنے لیڈر اور پارٹی کے پیغام کو پھیلانے کا مشن جاری رکھتے ہیں پھر چاہے کرکٹ میچ کے گراؤنڈ ہوں یا پھر قومی دنوں کی تقریبات ہم بانی پاکستان کے قول و فعل کو یاد رکھیں یا نہ رکھیں، اپنے لیڈر کے پیغام کو ضرور یاد رکھتے ہیں اور اس کے ہر عمل کا دفاع کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم سب ایک ہی رنگ کا پاسپورٹ

لیکر اپنے وطن کو خیر آباد کہتے ہیں مگر دیارِ غیر میں جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور دوستیوں کے نئے رشتے قائم کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے علاقے، زبان اور فرقہ کے متعلق بہت محتاط رہتے ہیں۔ ہم دیارِ غیر میں اگر کوئی تنظیم یا سماجی گروپ بھی بناتے ہیں تو ہمارے لئے پاکستانی شناخت ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ علاقہ، زبان، برادری، سیاسی وابستگی وغیرہ وغیرہ بھی جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم ایک ایسوسی ایشن یا تنظیم پر انحصار نہیں کرتے اور نا ہی اپنا ایک محبِّ وطن، قابلِ رشک اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نمائندہ چنتے ہیں بلکہ ہم اپنی اپنی پسند اور وابستگی سے لحاظ سے بہت سی تنظیمیں بنا کر سیاست بازی میں وقت بسر کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم پاکستان میں افسر شاہی، کرپشن اور اقربا پروری پر اپنے ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر اپنے دوست احباب کے ساتھ بہت بحث و مباحثہ کرتے ہیں مگر پھر اسی طرح کے سفارتکار کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوانے کو خوش نصیبی اور فخر سمجھتے ہیں۔

ہمیں منافقت اور مفاہمت میں یا حسد اور رشک میں یا قومی رہنما اور سیاسی مداری میں فرق سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں قومی تشخص، قومی شناخت اور ایک قوم جیسے لفظوں سے کیا لینا دینا کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ بس ٹھیک ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ سچائی کیا ہے، ہم سچ سننا چاہتے ہیں، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کیا ہے مگر ہم سچ کہنا نہیں چاہتے، کیونکہ ہم وہ عجیب لوگ ہیں جو اپنی ہی شناخت کے قیدی ہیں۔

ہمیں نواز شریف، آصف علی زرداری، الطاف حسین، اسفندیار ولی خان، مولانا

فضل الرحمن وغیرہ اور ان کی جماعتوں نے کیا دیا؟ انہوں نے ہم سے ہماری پاکستانی شناخت چھینی اور ہمیں اپنی الگ الگ فرقہ، زمین اور زبان کی بنیاد پر شناخت میں قید کر دیا۔ سیاست، جمہوریت اور آزادی رائے معاشرہ میں معاشرتی شعور بیدار کرتے ہیں۔ جن معاشروں میں سیاست نہ ہو، جمہوریت نہ ہو اور عوام کو آزادی رائے کا حق حاصل نہ ہو، اُس معاشرے میں نہ تو انصاف جنم لیتا ہے اور نہ ہی بنیادی انسانی حقوق لوگوں کو میسر ہوتے ہیں۔ آج دنیا میں جن معاشروں میں سیاسی و جمہوری نظام حقیقی معنوں میں نافذ ہے وہاں عوام کو بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل ہیں، قانون کی بالادستی بھی ہے، حاکم اور رعایا کے لئے قانون برابر ہے، عوام کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے اور حکمران عوام کی عدالت میں جواب دہ ہیں۔

دنیا کے عظیم اور اعلیٰ مذہب اسلام نے سیاست، جمہوریت، مساوات، عدل، قانون کی بالادستی اور آزادی رائے کا درس دیا اور ان پر عمل پیرا ہو کر ایک مہذّب معاشرہ کی تشکیل کا راستہ دکھایا۔ آخری نبی محمد ﷺ اور خلفائے راشدین نے عملی طور پر مساوات، عدل و انصاف اور بنیادی انسانی حقوق کی عظیم مثالیں قائم کیں جن پر چل کر آج مغربی دنیا نے خوش حال، طاقتور اور عظیم ریاستیں قائم کر لی ہیں مگر اسلام کے پیروکار مسلمان آج دنیا میں ذلیل اِس لئے ہو رہے ہیں کہ نہ تو وہ بدقسمتی سے دنیا کی کسی بھی ریاست میں اسلام کی اصل روح کے مطابق اسلام نافذ کر سکے اور نہ ہی اسلام کی تعلیمات کو سمجھ سکے اور اگر بات پاکستان کی کریں تو اب میرے جیسے مصنف کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور کس کس چیز کا رونا رویا

جائے۔ اگر لوگوں کو اپنی تاریخ جاننے اور پڑھنے کا شوق نہیں تو اس میں قصور کس کا ہے۔ اگر لوگ تاریخی حقائق سیاسی لگاؤ کی روشنی میں جانچیں اور ماضی میں ہوئے المناک واقعات کو بھی تعصّب کی نظر سے دیکھیں تو پھر ایسے لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ ایک دن یہ اپنے حق کے لئے کھڑے ہوں اور ایک دن یہ سچے کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا کہیں گے بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ پاکستان میں آج جو سیاسی طبقہ حکومت کر رہا ہے اور جو سیاسی قائدین پاکستان کے صوبوں اور مرکز میں اقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کر کے بیٹھے ہیں ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو فوج کے دورِ اقتدار میں دوطرفہ مفادات کی بدولت سیاست کے میدان کے کھلاڑی بنے اس میں ذوالفقار علی بھٹو سے لیکر نواز شریف سب ایک ہی حمام میں ننگے نہا چکے ہیں۔ پھر کچھ وہ ہیں جن کے باپ دادا کو انگریزوں سے وفاداریوں کے طفیل زمینیں عطا ہوئیں اور پھر وہ جاگیردار اور قبائلی سردار کہلائے، کچھ وہ ہیں جن کے بڑے ماضی میں ملک توڑنے کی سازشوں کا حصہ بنے رہے، کچھ وہ ہیں جن پر سنگین جرائم کے پرچے کٹے ہوئے ہیں، کچھ وہ ہیں جو جعلی ڈگریوں کی بدولت رکنِ پارلیمنٹ بنے بیٹھے ہیں، کچھ وہ ہیں جو حالات و واقعات کے طفیل زبان، فرقہ اور علاقے کی سیاست کر کے آج سیاسی، مذہبی اور تحریکی قائد کہلاتے ہیں۔

مگر پاکستان کی عوام کی اکثریت ایسی ہے جو ان ہی لوگوں کو اپنا قائد، رہنما، رہبر اور مسیحا مانتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ لوگ آج بھی نواز شریف، الطاف حسین، آصف علی زرداری اور ان جیسے سیاسی پنڈتوں کو ہی اپنا قائد مانتے ہیں اور ان کے جلسے اور

جلوسوں میں ان پر اپنی محبت اور والہانہ لگاؤ کا اظہار کرتے نہیں تھکتے جبکہ یہ سب کئی کئی مرتبہ اور کئی دہائیوں سے کامیابی سے اپنی سیاسی دکانیں لگائے بیٹھے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اِن سیاسی پنڈتوں نے سوائے قوم کو ان کے مسائل بتانے اور ان مسائل پر رونا رونے کے کچھ نہیں دیا مگر ان کے پیروکار ہیں کہ ان کی تعریفیں کرنے اور ان کے ہر عمل کا دفاع کرنے کو اپنے سیاسی ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(علامہ اقبالؒ)

کچھ سوالات آخر میں

پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے لئے اپنی مجموعی سیاسی زندگی کا جتنا عرصہ پاکستان کی جدوجہد کے لئے صرف کیا اس سے زیادہ عرصہ یہ سیاسی پنڈت پاکستان کے اقتدار پر قابض رہے ہیں۔ ان سیاسی پنڈتوں کی من مانی اور اقتدار کی ہوس کی بدولت پاکستان دولخت ہوا، مگر آج تاریخ اپنے اقتدار کی خاطر توڑ مروڑ کے پیش کیا جاتا ہے، جو شخص پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے میں ایک کردار تھا اس کو قائدعوام اور شہید کہا جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ نواز شریف جس نے ضیا الحق کی نرسری سے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا آج جمہوری نظام کو قائم رکھنے کا علَم بردار کہلایا جا رہا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ دُنیا میں مسٹر ٹین پرسنٹ کہلانے والا اور بے نظیر کے دورِ اقتدار میں اربوں روپیہ کا غبن کرنے والا پاکستان کا صدر بن گیا اور آج پاکستان کی سیاست کا اَن داتا مانا جا رہا ہے۔ کیا وجہ ہے الطاف حسین جو پچھلے بیس سال سے زیادہ عرصہ سے لندن میں قیام پذیر ہے اور جس نے کراچی اور سندھ کے شہری علاقوں کے اردو بولنے والوں کے لئے سوائے مسائل اور حقوق کا رونا رونے کے کچھ نہیں دیا۔ آج پاکستان

کی سیاست کا دانشور کہلاتا ہے۔ کیا وجہ ہے وہ مولوی اور ان کی جماعتیں جنہوں نے سوائے نفرتوں کے بیج بونے اور تقسیم کی سیاست کھیلنے کے سوا پاکستان کے عوام کو کچھ نہیں دیا آج بھی لاکھوں پاکستانی ان کی ایک آواز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے وہ سردار جو جدی پشتی پاکستان کے نظریہ اور سالمیت کے خلاف ہیں انتخابات میں جیت کر ایوانوں میں پہنچ جاتے ہیں اور جس قوم کا وہ استحصال کرتے ہیں وہی ان کے پیر چھوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے سندھ اور پنجاب کے جاگیردار جو اپنی زمینوں پر کام کرنے والوں کے ساتھ ہی زیادتیوں کا بازار گرم رکھتے ہیں مگر وہی لوگ ان کو ووٹ دے کر ایوانوں میں بھیجتے ہیں۔

دوسری جانب کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ جو پاکستان سے محبت کرتے ہیں، پاکستان کی سالمیت اور بقا کے لئے پاکستان کا گلا سڑا اور کرپٹ نظام تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی عوام انہی کا مذاق اُڑاتے ہیں، ان کی کردار کشی کرتے ہیں اور ان کے خلاف سیاسی مہم کا حصہ بنتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے اِن نام نہاد سیاسی قائدین نے سلسلہ وار ایک نظام کو جنم دیا ہے جو منافقت، جھوٹ، مطلب پرستی پر مبنی ہے۔ اِن سیاسی پنڈتوں نے ایک ایسا معاشرتی جرم کیا ہے جس کی بدولت محبِّ وطن پاکستانی قوم سے قومی شعور اور تشخص چھین لیا ہے۔ آج عام پاکستانی کے نزدیک وہی اس کا من پسند لیڈر ہے جو اس کے علاقے کا ہے یا اس کی برادری کا ہے، اس کا ہم زبان ہے، یا اس کے فرقہ کا ہے یا پھر اس کے شہر یا صوبے کا ہے۔ آج ایک عام آدمی کسی سیاسی قائد کو قائد ماننے

سے پہلے یہ نہیں سوچتا کہ چاہے یہ قائد میری ذات کے لئے ٹھیک ہو یا نہ ہو مگر ملک وقوم کے لئے بہتر ہے۔ چاہے یہ قائد میرے صوبے، شہر، برادری، زبان اور فرقہ کا نہ سہی مگر میرے ملک اور پوری قوم کے لئے تو بہتر ہے۔

ایسے حالات وواقعات کسی قوم کے اس وقت ہوتے ہیں جب وہ قوم نہیں ایک ہجوم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قومی سوچ کی جگہ ذاتی مفاد لے لیتا ہے۔ منافقت سوچنے کا انداز بن جاتی ہے۔ جھوٹ اور چور بازاری بام عروج پر پہنچ جاتی ہے، بڑے سے بڑا جرم روزمرہ کا معمول بن جاتا ہے اور قوم کے لٹیرے قوم کے قائد بن جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے آج پاکستان انہی حالات کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔

پاکستان میں لوگ جتنی گفتگو سیاست پر کرتے ہیں اور پاکستانی میڈیا میں جتنی کوریج سیاسی خبروں اور سیاستدانوں کو دی جاتی ہے اتنی دنیا میں کسی اور ملک میں نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے نظام میں ہر سطح پر غیر جمہوری عمل نظر آتا ہے۔ انصاف کے کٹہرے میں انصاف نہیں، قانون کے محافظ کے پاس تحفظ نہیں، سیاستدان کے پاس منزل نہیں، بزرگ کے پاس دانش نہیں، نوجوان کے پاس سلیقہ نہیں، تعلیم یافتہ کے پاس شعور نہیں، قابل کے پاس کام نہیں، افسر کے پاس ایمان نہیں، استاد کے پاس وسائل نہیں، صحافی کے پاس قومی ذمہ داری نہیں۔

مولوی کے پاس ہم آہنگی نہیں، عام آدمی کے پاس حق گوئی، اور فوجی کے پاس ہمت نہیں؟

کیوں پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں آمرانہ رویہ اور موروثی حاکمیت ہے؟

کیوں پاکستان کے عوام جب کسی سیاسی جماعت سے جڑ جاتے ہیں تو ایسا رویہ اپنا لیتے ہیں کہ جیسے اُن پر ایمان لے آئے ہوں کہ ان کی جماعت کا ہر فیصلہ صحیح اور ان کے قائد کا ہر عمل سچا؟ ایسا کیوں ہے کہ سیاسی جماعتیں ملک میں تو جمہوریت نافذ کرنے کی بات کرتی ہیں مگر ان کی اپنی جماعتوں میں جمہوریت نہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ مذہب کے نام پر بننے والی جماعتیں مذہبی کام کم اور سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں، ایسا کیوں ہے کہ ایک مذہبی رہنما مذہب کو اس کی روح کے مطابق پھیلانے کی بجائے اپنے مطلب کا پیغام عام کرتا ہے؟

کیوں پاکستان کے سیاستدان جاگیرداروں، وڈیروں، چودھریوں کے گھروں میں ہی پیدا ہوتے ہیں؟ کیوں پاکستان کے سیاستدانوں کا سفر فوجی حکومتوں سے شروع ہوتا ہے اور فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں ختم ہوتا ہے؟ کیوں پاکستان میں سیاسی جماعت ایک وقت میں فوج کر برا کہتی ہے اور دوسرے وقت میں فوج کو ملک کا اقتدار سنبھالنے کی اپیل کرتی ہے؟

کیوں پاکستان کے عوام کی زندگی میں صبر اور استقامت پسندی کی جگہ حسد اور دکھاوے نے لے لیا ہے؟ کیوں پاکستان میں مزدور سے لیکر سرکاری افسر تک اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک جائز یا ناجائز موقع کی تلاش میں رہتا ہے؟ کیوں آج پاکستان میں اگر کوئی نوجوان پڑھنے لکھنے میں دل لگا رہا ہے تو اس لئے کہ وہ جلد سے جلد کسی ترقی یافتہ ملک کو کوچ کر جائے؟

کیوں پاکستان میں آج بدعنوانی کا تناسب تعلیم یافتہ لوگوں میں زیادہ بڑھ رہا

ہے؟ کیوں آج مذہبی رہنماؤں میں فرقہ واریت کا رجحان زیادہ بڑھ رہا ہے اور مسلم اُمہ کا فلسفہ کم؟ کیوں آج پاکستان میں مساجد بھری ہوئی نظر آتی ہیں مگر مسلمانیت کم نظر آتی ہے؟ کیوں عام لوگوں میں منافقت زیادہ نظر آتی ہے اور سچ بات کہنے کی ہمت کم؟

کیوں آج پاکستان میں موبائل فون کال کی قیمت روٹی کی قیمت سے کم ہے؟ کیوں آج پاکستان میں ہر ایک کے پاس موبائل فون تو ہے مگر نوکری نہیں؟ ڈگری تو ہے مگر تعلیم نہیں، عقل تو ہے مگر شعور نہیں، سمجھ تو ہے مگر سلیقہ نہیں؟ مسلمان تو ہیں مگر ایمان نہیں؟ کیوں آج ماں باپ غلط حرکتوں پر اولاد سے سوال کرنے میں ڈرتے ہیں؟

کیوں سمندر، دریاؤں، زرخیز زمینوں اور معدنی وسائل سے مالا مال ملک پاکستان بجلی، پانی، گیس سے محروم ہے؟ کیوں آج دس لاکھ فوج اور جدید ہتھیار رکھنے والے ملک کی سرحدیں دشمنوں کے لئے آزاد ہیں؟ کیوں آج شہروں کی نگہبانی کرنے والے دہشتگردوں کے آگے زیرِ نظر آتے ہیں؟ کیوں آج پاکستان میں کسی بے گناہ کا قتل اور کسی معصوم کی آبروریزی ایک میڈیا کی خبر کے سوا کچھ نہیں؟

کیوں پاکستان میں انٹرنیٹ (گوگل) پر دنیا میں سب سے زیادہ عریاں اور جنسی فلمیں تلاش کی جاتی ہیں؟ کیوں پاکستانی ہی سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ سیاسی و مذہبی جنونیت پر بحث بازی کرتے نظر آتے ہیں؟

کیوں پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہونے کے باوجود، قتل و غارتگری کا گراف دنیا میں سب سے زیادہ ہونے کے باوجود مہنگائی اور لوٹ مار عروج پر ہونے

کے باوجود، عدل و انصاف اور قانون کی عدم دستیابی کے باوجود، پاکستان کی عوام چپ ہے؟ کیوں پاکستان کا عام آدمی آج خاموش ہے؟

کیا پاکستان کا عام آدمی اِن حالات سے مطمئن ہے یا پھر عام آدمی نے بے غیرتی کی زندگی گزارنے کو ہی اپنا مقدر سمجھ لیا ہے؟ کیا کبھی پاکستان میں حالات بدلیں گے؟ اگر بدلیں گے تو کون بدلے گا؟ یہ نااہل، منافق، بدکار، بدعنوان اور ضمیر فروش سیاستدان یا پھر یہ ناجائز طریقوں سے بننے والے سرمایہ دار، یا پھر رشوت خور اور نااہل افسران، یا پھر ظالم و آمر چودھری، وڈیرے اور قبائلی سردار اور یا پھر امریکی اور برطانوی آقاؤں کی بات سننے والی پاکستان کی افواج؟

اور اگر کوئی اِن میں سے ہی پاکستان کے حالات تبدیل کرسکتا ہے تو اس نے اب تک کیا کیا ہے؟ کیا اس کا ماضی بے داغ ہے؟ آیئے ہم سب اپنی اِس جھوٹی شناخت کی قید سے آزاد ہوں اور ایک ہی شناخت پر فخر کریں اور کہیں کہ ہاں میں کسی شناخت کو نہیں جانتا میں صرف اور صرف پاکستانی ہوں۔ میں نظریۂ پاکستان کا پاسبان ہوں جس کے لئے میرے ماں باپ اور آباواجداد نے قربانیاں دیں اپنی جدی پشتی شناخت کو خیرباد کہا کیونکہ اسلام کے نام پر جو شناخت ہمیں ملی وہ ہے پاکستان۔۔۔

☆☆☆